طوائف

طوائف

اختر حیات

الفت پبلشرز
9 سرکلر روڈ، لاہور 2

قیمت 21 روپے

معراج دین پرنٹرز، لاہور

دیباچہ

طوائف کے موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے بار بار سوچنا پڑتا ہے کہ کہیں ہم بھی تماشائی تو نہیں۔ طوائف کے موضوع سے وہی انصاف کر سکتا ہے جو اس کی بربادی اور درد کی واردات خود پر طاری کرنے کی ہمت رکھتا ہو۔ صدیوں بہت سے شاعر اور ادیب طوائف کو اپنے اپنے تخیّل کی رنگین عینک سے دیکھتے رہے چنانچہ طوائف کے مطالعے سے دلکشی اور تفریح کی صورتیں تو پیدا ہو گئیں اصلاح کا راستہ نہ نکل سکا۔

بیسویں صدی کی تلخ حقیقت نگاری نے نئے اسلوب تلاش کیے۔ لکھنے والوں نے طوائف کو ایک مظلوم اور کچلی ہوئی مخلوق سمجھا۔ اسے معاشرے کے لیے ایک چیلنج قرار دیا۔ پڑھنے والوں تک اس کیفیت کا ابلاغ ہوا اور ہم سب نے یہ محسوس کیا ہے کہ طوائف ہم سے الگ نہیں ہمارے ہی وجود کا حصّہ ہے۔ طوائف کے موضوع پر لکھی گئی بیشتر کہانیاں اسی نفسیاتی نکتے کو بیان کرتی ہیں۔

اس انتخاب (طوائف) کی تمام کہانیاں ہمارے اپنے معاشرے کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اختر حیات نے انہی افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا انتخاب کیا ہے جن میں اظہار کی جرأت ہے اور جن کا اسلوب افسانے کی عظیم روایت کو آگے بڑھانے کی قدرت رکھتا ہے

صابر لودھی

(شعبۂ اُردو) گورنمنٹ کالج لاہور۔

طوائف

طوائف ہمارے مہذب معاشرے کی بدنام ترین اور دھتکاری ہوئی مخلوق ہے ۔
لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اس مخلوق کی حُسن فروشی، غمزہ طرازی اور عشوہ نگاری نے تہذیب انسانی میں واقعات وکیفیات کا نیا منظر نامہ مرتّب کیا ہے۔ عورت کو بالعموم کمزور تصوّر کیا جاتا ہے۔ لیکن طوائف ایک ایسی عورت ہے جو بے حد فعّال ہے۔ اور معاشرے پر اثر انداز ہونے کی قوت رکھتی ہے۔ قدیم زمانے میں کہا جاتا تھا کہ

"عورت کا دِل ایتھنز کی منڈی ہے۔"

اور وہ عورت جو ایتھنز کی منڈی کے جزر و مد کو اپنی گرفت میں رکھتی تھی طوائف تھی۔
بابل کی زہرہ، یونان کی سپاشیا، دکن کی بھاگ متی، مالوے کی رُوپا، حیدرآباد کی صاحب آگرے کی مشتری، دہلی کی لال کنور، لکھنؤ کی امراؤ جان ادا، پنجاب کی موراں اور کلکتے کی حجاب اس قسم کی طوائف ہی کے مختلف روپ ہیں اور اُردو افسانے میں ان عورتوں کی روحوں کا تعاقب پوری فنکاری اور چابکدستی سے کیا گیا ہے۔
اختر حیات نے یہ اپج کی ہے کہ طوائف کی روح کے نئے مظاہر جدید افسانے میں تلاش کیے ہیں۔ اور بالواسطہ ثابت یہ کیا ہے کہ زمانہ بے شک تغیر و تبدّل کی زد میں آتا رہے لیکن طوائف معاشرے کا ایک ایسا کردار ہے جس کی سج دھج کو ثباتِ دوام حاصل ہے تو دوسری طرف اس شمعِ محفل کا افسانہ سنانے والے بھی ہر دور میں نئی آن

بان اور شان کے ساتھ سامنے آتے رہتے ہیں۔ مولوی نذیر احمد، مرزا ہادی حسن رسوا
قاضی عبدالستار، قاری سرافراز حسن اور ایم اسلم کی طوائف نگاری جب تاریخِ ادب کا
حصہ بن گئی تو ان کی جگہ غلام عباس، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، رحمٰن مذنب،
فرخندہ لودھی، عصمت چغتائی اور آغا بابر، جیسے افسانہ نگاروں نے لے لی اور آنندی
تقدس، ہتک، گشتی، پیشہ، توازن، کنجری اور بوٹیاں جیسے افسانے پیش کر دیئے۔
اختر حیات کی کتاب "طوائف" شہد آگیں نہیں بلکہ یہ اس زہر کی نشان دہی کرتی
ہے۔ جس کی افزائش میں معاشرہ بھی شریک ہے۔ لیکن دلچسپ بات ہے کہ ہم نے
اس زہر کو تاحال شہد سمجھ کر ہی قبول کر رکھا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ اختر حیات کی یہ کتاب
جو طوائف کے موضوع پر چند نمائندہ افسانوں کا انتخاب ہے دلچسپی سے پڑھی جائے
گی اور یہ کتاب فکر کی زیریں سطح کو بھی متحرک کر دے گی۔ مجھے اس کتاب کی اشاعت
کے پس پشت یہی مقصد نظر آتا ہے۔

انور سدید
۷/۲ اسٹیج بلاک اقبال ٹاؤن
لاہور - ۱۸

تیرے نازک سے پروں پر زر و سیم کا بوجھ
تو نے راحت کی تمنا میں جو غم پالا ہے
تو نے سرمائے کی چھاؤں میں پنپنے کے لیے
دل کی تزئینِ فسردہ کا اثاثہ لے کر

تیری پرواز کو آزاد نہ ہونے دے گا
وہ تیری روح کو آباد نہ ہونے دے گا
اپنے دل اپنی محبت کا لہو بیچا ہے
شوخ راتوں کی مسرت کا لہو بیچا ہے

چاندنی

واجدہ تبسم

عورت تھی یا ایٹم بم ——— ؟ حواسوں پر ——— ذہن پر، ہوش پر، سارے وجود پر یوں گری کہ سب کچھ تہس نہس ہو گیا ——— راکھ ہو گیا ———

سکندر دیوانہ ہو گیا ——— ان معنوں میں دیوانہ نہیں کہ پتھر اٹھا اٹھا کر دے مارے، کسی کو جانے پہچانے ہی نہیں، بلکہ ان معنوں میں کہ اپنا آپ بھول گیا ——— ایک سڑی ماری عورت کے پیچھے ——— عورت بھی کون ——— ؟

رنڈی ——— !

مگر بھئی کیا عورت تھی کہ واہ وا ——— بدن کی چمڑی کسی کسی کہ کوئی چہرہ دیکھنا چاہے تو آئینہ سمجھ کر دیکھ لے ——— چھاتیاں یوں تنی تنی کہ کوئی کنکری دے مارے تو ٹن سے بج اٹھیں ——— کمر تو مٹھی میں سما جائے ——— بال ایسے گھنگھور گھور کہ سارے بدن سے ننگی ہو کر بیٹھ جائے اور بال کھلے چھوڑ دے تو کسی کو پتہ نہ چلے کہ اس سیاہ پردے کے پیچھے کون سی آگ دہک رہی ہے ——— کیسی دمادم بجلیاں کوند رہی ہیں ——— قد بس بالکل اتنا کہ نخرے میں آ کر مرد کے کندھے سے سر ٹکائے تو گردن کے خم میں پہنچ کر اونچائی فٹ ہو جائے۔

اور مرد کو بس یہی تو اچھا لگتا ہے کہ عورت اس سے نیچی رہے ـــــ دبتی رہے ـــــ دبی رہے ـــــ اور بس سکندر بھی یہی کچھ تھا جو کہ ایک مرد ہوتا ہے ـــــ جان تو اس کے ایک ہی تھی مگر وہ ایک چھوڑ ہزار جانوں سے عاشق ہوا۔ مٹ گیا۔ کیسے کیسے چاہا کہ اسے زندگی بھر کے لیے اپنے اگلے کا تعویذ بنائے مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ رنڈی کا دل سدا ہنڈی ہیں ـ ایک کے گلے سے عمر بھر کیلئے لپٹ کر کیا اسے اپنی زندگی تباہ کرنی تھی ـــ ؟ چمکیلی چکنی ناگن کی طرح خود ہی پیچھا کیا لیکن جہاں مڑ کر ہاتھ میں اٹھانا چاہا ـ سَل سلا کر چھوٹ گئی، دغا دے گئی ـــ

ساری داستان یہ تھی کہ وہ حرّافہ جس کا نام چاندنی تھا، کسی شادی کی محفل میں بلوائی گئی تھی۔ شادی کریم بھائی بزنس مین کی بیٹی کی تھی کہ جس کے کپڑے کی چار چار ملیں تھیں ـــــ پھر اناج کی دکانیں ـــــ پھر زیورات کی دکانیں ـــــ پھر دواؤں کی دکانیں ـــــ پھر جنرل اسٹور تھے اور پھر ـــــ بس اس پھر پھر کی روداد ہی یہ تھی کہ پیسہ پھرکی کی طرح پھُر پھُر پھرتا تھا ـــ اور جب بیٹی کی شادی ہوتی ٹھہری تو کون سی بات چھوٹی ـــــ ؟! ہر ہر قسم کے اعلےٰ سے اعلےٰ انتظامات تھے اور اُسی میں ایک انتظام یہ بھی تھا کہ ناچ گانے سے بھی باراتیوں اور حاضرین جلسہ کو محظوظ کیا جائے ـــــ اب ان چاندنی بیگم کے یہ ٹھاٹ تھے کہ وہ ایسی ویسی محفلوں میں قدم بھی نہ دھرتی تھیں۔ دو سو، پانچ سو کی ان کے پاس کون بساط تھی ـــــ وہ جب بھی محفل میں گئیں رات بھر کے ٹھُن ٹھُن پانچ ہزار روپے گنوا لیے ـــــ اور وہ بھی اس صورت اور اس شرط میں کہ کوئی ان کی انگلی بھی نہ لگائے ـــــ ان کا جسم انگلی لگانے

کیے پیئے نہ بنا تھا وہ توصرف آواز بیچتی تھیں اور بس لچکیلے جسم کی چلت پھرت سے پیسہ بٹوار کرتیں ــــــ

شادی کا ہنگامہ، نکاح خوانی کا دھوم دھڑکا۔ کھانے والانے سے فراغت جب سب مرحلے طے ہو گئے تو محفل سجی ـــــ اگلی قطار بے حد رئیس زادوں کی تھی۔ ـــــ وہ جو ایک ایک ادا پہ خزانے خالی کر دیتے ہیں ـــــ اس کے پیچھے وہ جن کے پاس سیکنڈ ہینڈ کاریں اور سیکنڈ ہینڈ دل ہوتے ہیں۔ اس کے پیچھے بیٹھے ہوئے بگڑے ہوئے نواب جن میں اکثریت حیدرآباد کے برباد نوابوں کی تھی ـــــ اس کے بعد ایسے ہی جیب خالی رکھنے والے اور پٹاپٹ آنکھیں مارنے والے جیسے اللہ کے آنکھ مارنے سے رنڈی ان کی گود ہی میں تو آ بیٹھے گی ـــــ پھر تو محلّے ٹولے کے لوگ، خانساماں لوگ، بہرے، ڈرائیور شوفر لوگ، جو صرف کھڑے کھڑے ترسی ترسی نگاہوں سے نظارۂ محبوب کرتے ہیں، اگلی صف میں ظاہر ہے سکندر بھی تھا ـــــ کیونکہ وہ خود بھی کپڑے کی چھ ملوں کا مالک تھا ـــــ!!

گانا شروع ہوا ـــــ چاندنی نے پہلے تو حاضرینِ شادی پہ ایک چھلتی سی نظر ڈالی اور پھر شاید محفل کا رنگ دیکھ کر شروع ہو گئی ــ

ہم پیئں انہیں بھی پلائیں تمام رات
جاگیں تمام رات جگائیں تمام رات

سننے والوں نے پہلو بدلنے شروع کئے ـــــ چاندنی ڈائس پر تھی اور سکندر ڈائس سے بمشکل دو تین قدموں کے فاصلے پر ـــــ اس نے پھر ادا

سے تان لگائی ؎

دابے رہے پروں میں نشیمن کو رات بھر
ان گیسوؤں کی لی ہیں بلائیں تمام رات

اور کم بخت نے اپنے سیاہ اور لمبے بال کھول کر خود ہی بلائیں لے ڈالیں
—— کتنے کٹے، کتنے مرے، کتنے گھائل ہوئے اس کا لحاظ کیے بغیر
وہ چالو تھی ——

شب بھر رہے مبہم ہم آغوشیوں کے لطف
ہوتی رہیں قبول دعائیں تمام رات

سننے والوں نے اس قدر بے چین ہو کر، یوں بے کل ہو ہو کر صوفوں پر کروٹیں
بدلیں جیسے صوفوں میں کن کھجورے گھس پڑے ہوں ——
سیاہ گھٹاؤں میں سے چاند ایسا چمکتا چہرہ —— کافر شباب، صحیح معنوں میں
کافر کر دینے والا —— غضب خدا کا نامون کا پھنسا ہوا بلاؤز کہ یہ پتہ ہی نہ
چلے کہ کپڑا کدھر ہے اور بدن کی جلد کدھر —— اور پھر اس نے تان ملائی ——
سکندر ہی کو دیکھ کر! ——

مدّت سے آرزو ہے یہ دل میں بسی ہوئی
اے کاش تم کو ساتھ سلائیں تمام رات

اک دم محفل میں ٹیس پڑ گئی —— سب نے بوکھلا کر ایک دوسرے
کو دیکھنا شروع کیا —— سکندر صوفے پر سے کودا اور اس کے قریب جا کر
بولا ——

"غضب کرتی ہیں آپ بھی ـــــ غزل میں اس شعر کا پتہ ہی نہیں جو
چاہے الٹ پلٹ گا رہی ہیں آپ ـــــ!"

وہ ایک عورت کی طرح نشیلی اور دل جیت لینے والی ہنسی ہنس کر بولی ـ

"میں کب کہتی ہوں غزل میں تھا ـــــ یہ شعر تو اپنے دل سے جوڑا ہے"
سکندر صوفے پر واپس آگرا ـــــ اب اس میں کچھ پوچھنے، سوچنے سمجھنے،
کسی بات کی صلاحیت نہیں رہ گئی تھی۔ ابھی ابھی تک تو چاندنی ایک خوبصورت
دیئے کی مانند تھی، جھلملاتی شمع کی مانند کہ جس کی طرف دیکھنے سے آنکھوں کی جوت
ماند نہیں پڑتی، بلکہ خود آنکھوں میں جگمگاہٹ جل اٹھتی ہے لیکن ابھی ابھی وہ ایک
شعر "دل سے جوڑ دینے" کے بعد اُسے ادا سے پڑھنے کے بعد، ایک بجلی بن
گئی تھی ـ ـــــ ایسی بجلی جس کی طرف دیکھو تو نہ صرف یہ کہ بینائی سے ہاتھ دھونا
پڑے، بلکہ جو تن من سب کو جلا کر خاکستر کر دے ـــــ

رنڈی پر دل آجانا ایسی کوئی پریشانی کی بات نہیں ـــــ وہ بھی تو دال، آٹے
بھاجی، پھل کی طرح ایک سودا ہوتی ہے کہ پیسہ پھینکو اور من بھاتی چیز حاصل
کرلو ـــــ اور سکندر نے بھی یہی کیا ـــــ وہ تو لاکھوں میں کھیلتا تھا، اس
کے لیے پیسہ بے معنی شے بن چکا تھا ـــــ بمبئی جیسے شہر میں مالا بار ہلز پر
کوٹھی ـــــ اور وہ بھی ذاتی کوٹھی ـــــ کیا بات ہے جناب ـــــ
ایسی ایسی کئی کوٹھیاں اور زمینیں اور ذاتی جائداد، اس کی قسمت سے بمبئی میں پھیلی
ہوئی تھی۔ نام کا ہی سکندر نہ تھا ـــــ اُسے پتہ لگ چکا تھا کہ چاندنی بھی اُسی
کے قرب و جوار میں ایک چھوٹی سی خوبصورت سی کوٹھی میں رہتی ہے ـــــ

جس کا نام اس نے "چاند نگر" رکھ چھوڑا تھا ــــــ اس نے یوں کئی بار آتے جاتے اس نام کو دیکھا ہوگا لیکن یہ پتہ نہ تھا کہ چاند نگر میں واقعی کوئی چاندنی بھی چھپی ہوگی ــــــ

ایک دن وہ بڑے ٹھاٹ کے ساتھ وہاں پہنچ گیا ــــــ ڈرائنگ روم میں ایک سڑیل سی بوسیدہ بڑھی نے جب اس کا استقبال کیا تو وہ حد درجہ بور ہو گیا ــــــ یہ کیا مصیبت ہے سالی ــــــ یہ اس قسم کی ماڈرن اور مہذّب خواتین اپنے ساتھ نائکہ کیوں چپکا لیتی ہیں ــــــ کم سے کم الیسیشن ڈاگ سے تو یہ کام نکل ہی سکتا ہے ــــــ اشارہ کیا کہ وہ دوڑا ــــــ اب آپ فرض کیجئے میں آپ کی بیٹی، یا پوتی یا نواسی، جو کچھ بھی وہ ہیں، انہیں اٹھا کر لے بھاگوں اور کار میں بٹھا کر چھو ــــــ تو جناب آپ میرا کیا سدھار لیں گی ــــــ ؟ وہ ہنسا اور بے حد مہذّب مسکراہٹ ہونٹوں پہ لاکر اور دل کی ساری تلخی اور بورّیت دل میں گاڑ کر بولا ــــــ

"میں مس صاحبہ سے ملنا چاہتا ہوں"

ــــــ پھر اس جملے سے جس گفتگو کی ابتداء ہوئی تھی، اس کے اختتام پر جاکر اُسے یہ پتہ چلا کہ یہ جو چاندنی بیگم ہیں ــــــ چاند ہی کی کرنوں کی طرح سُتیل، سنہری، پاک اور ہاتھ میں نہیں آنے والی ہیں ــــــ اس لیے کہ وہ رنڈیوں کے اس خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جو صرف گلا ــــــ یعنی آواز اور جسم کی پھرت، یعنی رقص کا ہی سودا کیا کرتی ہیں ــــــ " ادھر وہ سب کچھ نہیں چلتا جو آپ سوچ کر آئے ہوں گے ــــــ " اور پھر بھی ایک رات کے ۵ ہزار

!! سکندر نے اپنا سر ٹھونک لیا —— پھر دل نے سمجھایا ——

"ننکو میاں —— اپنا رستہ پکڑو —— رات بھر کے ۵ ہزار دے کر بھی اخیر میں کیا ملیں گا بول کے —— ؟" لیکن اب سکندر کا عشق اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ اور کچھ نہیں تو نہ سہی، خالی نگاہوں کی پیاس ہی بجھتی رہے۔ چلتے چلتے اس نے بڑے ملائم الفاظ اور میٹھے لہجے میں اتنی بات کہہ دی ——

"آپ کیوں اُن کے ساتھ آنے کی تکلیف گوارا فرمائیں —— ؟ میں خود آکر شام کو انہیں لے جاؤں گا۔"

شاید بڑھیا کو اپنے مال کے "پکے پن" کا یقین تھا، یا سکندر ہی اُسے ٹماٹر نظر آیا ہو —— بہرحال وہ اس بات پر راضی ہوگئی کہ چاندنی اس کے ساتھ تنہا ہی جائے ——

وہ رات بجائے بارہ گھنٹوں کے بارہ صدیوں کے بعد آئی اور سکندر نے کچھ یوں سوچا کہ ممکن ہے قیامت ایسے ہی آتی ہو !!

سکندر نے اُسے بے حد آرام دہ نرم صوفے میں لا بٹھایا اور بے حد قریب بیٹھ کر بالکل بچوں کے سے انداز میں ایک ٹک اسے گھورنے لگا۔ بچے ایسے ہی گھورتے ہیں تاکہ پلک تک نہ ماریں —— ان بے چاروں کو بھلا محفل کے طور اطوار، آداب لحاظ کیا معلوم —— وہ تو بس جس چیز پر نگاہ جم جائے دیکھے ہی جاتے ہیں —— اور سکندر بھی اس وقت اپنے جذبات کے ہاتھوں بچہ سا بن کر رہ گیا تھا۔ بڑی بے باکی، بڑی ملائمیت بڑے بھول پن سے اُسے نگاہ بھر بھر کے دیکھے گیا —— چاندنی کھل کھل کر کے بڑی شفاف
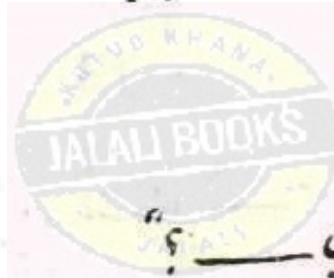
ہنسی ہنس پڑی ——

" یوں کیا گھور رہے ہیں —— ؟"

" تم بڑی خوبصورت ہو —— " وہ بے حد سچائی سے بولا۔

" آپ کا تعریف کرنے کا انداز بھی خوب ہے —— " اور جیسے کانچ کی چھوٹی چھوٹی بہت سی کٹوریاں، بہت سی کٹوریوں سے ٹکرا گئیں۔

" مجھ سے شادی کر لو نا —— " سکندر بالکل اس انداز سے بولا جیسے کوئی بچّہ اپنے دوست سے بڑی معصوم سی بے تکلفی سے کہے —— اپنی یہ پتنگ مجھے دے دو نا —— !"

چاندنی نے ذرا حیرت سے اس کی طرف دیکھا —— ذرا سا ہنسی —— پھر بولی ——

"شادی کریں تو بچّے ضرور پیدا ہوتے ہیں ——"

سکندر حیرت سے بولا۔ " پھر —— ؟ یہ تو بے حد سہانی بات ہے —— " وہ ہنس دیا ——

" اجی جناب —— " چاندنی نے بہت دور جا کر بات کا سلسلہ جوڑا —— " میں نے ایسی بھی کئی خواتین دیکھی ہیں جن کا حسن "ایک دو بچّوں کے بعد ناف تک لٹکنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے میرا پیشہ ایسا ہے کہ جب تک جسم ساتھ دیتا ہے پیسہ آتا رہتا ہے۔ بعد میں تو بس —— جی ہاں —— معاملہ ختم ——"

وہ یک لخت بے حد اداس ہو گئی۔

سکندر مارے جوش کے دوسرے صوفے پر جا بیٹھا —— " یہ تم

کیا کہتی ہو جسم پیسے کا دروازہ ہے ـــــ ایک رات کے پانچ ہزار ہی یعنی ہو نا ـــــ؟ اب تم ذرا حساب جوڑ کے مجھے بتاؤ کہ اندازاً تمہاری عمر کتنی ہے اور ابھی آگے کے دن زندہ رہنے کا سوچ سکتی ہو ـــ چلو زندگی بھر پانچ ہزار روپے روزانہ کے حساب سے دیئے تمہیں شہری سکّے ـــ"

چاندنی بے حد بھرپور ہنسی ہنسی ـــــ "جناب چار دن بعد جب عشق کا خمار اترے گا اور حضور ٹھنڈے پڑ جائیں گے تو پانچ ہزار تو کد مصر پانچ نئے پیسے بھی پھینک کر نہ ماریں گے ـــــ"

سکندر جھلا کر بولا ـــ" یہ غلط ہے "

ہونہہ غلط ـــــ؟" وہ پھر ہنسی ـــــ" جب تک یہ کھال آئینے کی طرح چمکتی ہے اور جب تک یہ جسم تنا ہوا رہتا ہے تبھی تک مرد کی محبت بھی قائم رہتی ہے، ورنہ تو بس ......" وہ پہلی بار بگڑ بیٹھی ـــ" آپ یہ سب سنانے کے لیے ہی مجھے یہاں لائے ہیں یا کچھ سنیئے گا بھی ـــ؟"

سکندر چاپلوسی سے بولا ـــــ" آج تو وہ سب کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے جو تم نے اپنے دل سے شعر میں جوڑا تھا ـــ یاد ہے نا ـــ؟" اور سکندر نے ہاتھ بڑھایا کہ اُسے اپنے قریب کرے ـــــ

چیں ـــ ایں ـــ اُوں ـــ باہر آؤٹ ہاؤس سے کسی مریل سے بچے کے رونے کی آواز آئی اور سکندر جھلا گیا ـــ ایکدم وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ باہر دو ایک منٹ جھانکتا رہا، پھر گرجتا ہوا واپس آکر صوفے میں دھم سے گر پڑا ـــ "کم بخت نے چین حرام کر دیا ہے ـــ جب دیکھو

تب چیں —— چیں —— چیں —— بچے کو اٹھا کر پھینکوا نہیں دیتیں اماں جی —— "

چاندنی نے اتنے بعد خود پہلی بار بات کی ——

" آپ حیدر آباد کے نواب ہیں" ؟

سکندر نے اس کی طرف ذرا حیرت سے ہنس کر دیکھا پھر بولا —کیوں ؟ تمہیں کیونکہ احساس ہوا —— ؟ پھر خود ہی بولا —— " نواب تو خیر کیا ہوں، ہاں بھگوڑا ضرور ہوں " ——

" بھگوڑا —— ؟ " چاندنی حیرت سے ہونٹ دباتے لگی۔

" ہاں ایکشن کے وقت کچھ عقل ساتھ دے گئی —— تھوڑا بہت اثاثہ حضور ابا مرحوم کا پاس تھا، لے کر بمبئی بھاگ کھڑا ہوا —— اماں جی کو بھی ساتھ لے آیا —— اوپر والے نے قسمت میں آرام لکھ دیا تھا نا —— کاروبار میں وہ ترقی ہوئی کہ بس نوابی پیچھے پڑ گئی اور ایسی ایسی کئی کوٹھیاں خدا نے دے دیں کہ حیدر آباد میں رہ کر خواب میں نہ سوچا تھا کہ کبھی ملیں گی " —— وہ رکا " لیکن تمہیں یہ سوال کیسے سوجھا —— ؟ کیا بات چیت سے میں حیدر آبادی لگتا ہوں —— ؟ میری اماں جی تو یو۔ پی کی ہیں —— ! "

وہ ہنس دی —— " نہیں یہ بات نہیں —— دراصل آپ کا خاندان کا دبدبہ اور گرجنے برسنے کی ادا —— " وہ پھر کھل کھل کر کے ہنسی —— " غریبوں کے بچوں کو محض رونے کی سزا یہ کہ اٹھا کر پھینکوا دیئے جائیں، صرف نواب ہی دے سکتے ہیں —— " اس نے قدرے رک کر، بڑی ادا سے سر اٹھا کر پوچھا —— " کیوں غلط کہا میں نے ؟ " ——

سکندر بے حد جھلّا اٹھا ——

" قسم خدا کی —— حد ہوگئی —— جس رات کو سہاگ رات کی طرح جیبن اور خوشگوار گزرنا تھا وہاں کس درجہ بد ذوقی ہو رہی ہے —— کوئی تک ہے بھلا ——؟؟ "

چاندنی تنک کر بولی ——

" واہ —— یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ آج کی رات سہاگ رات تھی —— ؟ آپ کس وعدے پر مجھے یہاں لائے تھے —— ؟ گیت سننے اور رقص دیکھنے کے وعدے پر نا —— ؟ آپ تو تیسری ہی بات سوچ رہے ہیں —— ؟"

" اور جو میں زبردست بن جاؤں ؟ ——

چاندنی اسی اطمینان سے بولی —— " میں ایسا سمجھتی ہوں کہ دو مرد مِل کر تو ایک عورت کو زیر کر سکتے ہیں لیکن ایک مرد —— ہونہہ —— ؟" اس نے کچھ حقارت سے اور نفرت سے سکندر کو دیکھا۔

سکندر ہنسا —— " نام کا ہی سکندر نہیں ہوں، قسمت کا بھی ہوں - وہ جس نے سارا ہندوستان فتح کیا تھا —— "

" ضروری نہیں کہ عورت کے دل کو بھی فتح کر سکے —— " چاندنی نے جملہ پورا کر دیا۔

اوں —— اوں —— اں —— پھر اسی آواز نے بات کا سلسلہ ختم کر دیا —— تھوڑی دیر خاموشی رہی - پھر سکندر گویا ہوا -

" اماں جی کو بڑا شوق ہے بچے پالنے کا —— کتے کے بچے، خرگوش کے

بچّے ـــــ اِس کے بچے، اُس کے بچے ـــــ

اس کے اندازِ بیان پہ چاندنی کو ہنسی آنے لگی ـــــ وہ ساتھ ہی ساتھ گنگنانے بھی لگی تھی ـــــ سکندر ذرا جوش سے اُمڈ بیٹھا ـــــ " ظاہر ہے انسان کے بچّے ـــــ یعنی میرے بچے کی بھی انہیں تمنا ہو گی ہی ـــــ لیکن جسے انہوں نے پسند کیا ـــــ اس نے مجھے ناپسند کیا ـــــ " اس نے بڑے معنی خیز انداز سے چاندنی کو ہنس کر دیکھا۔ اور ہنس کر ذرا بے باکی سے اپنا ہاتھ بڑھایا ـــــ چاندنی خطرہ بھانپ کر کچھ پیچھے ہٹی اور دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھ لیے ـــــ

سکندر خالص بدمعاشی کے موڈ میں تھا ـــــ لپک کر بولا ـــــ " چاند۔ داغ جی کی چیز ہو جائے " ؎

وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

چاندنی کسمسا کر بولی۔ " یہ باتیں کوئی اچھی باتیں ہیں ـــــ ؟ اب میں آپ سے صاف صاف کہتی ہوں کہ میرے مذہب میں جسم کو کسی کا ہاتھ لگنے دینا حرام ہے " ـــــ

" ہٹاؤ بھائی جسم وسم کے جھگڑے کو ـــــ مجھے احتراماً صرف جنت کے کنگوروں کو چھونے کی اجازت دے دو " ـــــ

چاندنی ڈھیٹ بن کر بولی ـــــ " کنگورے، برجیاں، گنبدِ سنگِ مرمر کی چٹانیں، یہ سب چیزیں ناقابلِ حصول ہیں۔ حضور ـــــ بس کیجئے نظارہ دُور دُور سے ـــــ " وہ گنگنانے لگی ـــــ گنگناتے گنگناتے وہ سنجیدہ ہو کر بولی ـــــ دیکھئے سکندر صاحب ـــــ میں جس انداز سے سوچتی ہوں آپ نہ سوچ پائیں گے ـــــ اپنی ماں کا حشر میرے سامنے ہے۔ اپنی خالہ کا

حالِ تباہ میں نے دیکھا ہے۔ میری کئی جان پہچان والیاں ہیں جنہوں نے جسم کی تجارت کی، نتیجے میں انہیں کیا ملا ـــــــ؟ مرد کی ذات بے حد کمین ہوتی ہے ـــــــ وہ صرف دو لمحے کی لذت کے بارے میں سوچتا ہے۔ اس کے لیے اتنے جتن کرتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں تک لٹانے سے نہیں چوکتا ـــــــ عورت کو چوس چوس کر پھوک بنا دیتا ہے ـــــــ دنیا میں سارا جھگڑا پیٹ اور پیسے کا ہے آپ آج میرے جسم کی خوبصورتی سے مسحور ہو کر مجھ سے شادی تک کرنا چاہتے ہیں لیکن چار چھ راتوں میں ہی جب کس بل نکل جائے گا۔ میں قدموں تلے کی دھول بنا دی جاؤں گی۔ میں ممکنہ حد تک جوان رہنا چاہتی ہوں کہ زندگی کا کچھ تو مزہ لے سکوں ـــــــ جسم کا سودا کروں گی تو ربڑ کے ہوا نکلے ہوئے غبارے کی طرح میرا حشر ہو کر رہ جائے گا۔ ورنہ دل تو کیا کیا نہیں چاہتا ـــــــ اور کیوں نہ چاہے ـــــــ کیا عورت نہیں ہوں میں؟؟"

ـــــــ وہ تناسکے کے ساتھ اٹھی ـــــــ "چنے آپ کیوں اپنا وقت برباد کر رہے ہیں اور ساتھ ہی میرا دماغ بھی خراب کر رہے ہیں۔ مجھے نہ چاہئیں آپ کے پانچ ہزار، دس ہزار ـــــــ مجھے جانے دیجئے ـــــــ پانچ ہزار میرے پاس کیا اوقات ہے ـــــــ اُسی رات، جب آپ سے پہلی بار بھینٹ ہوئی ہے۔ میں نے بجائے پانچ کے ساڑھے سترہ ہزار بنا لیے تھے؟ آپ اتراتے کس بات پر ہیں ـــــــ؟"

"واہ بھئی واہ ـــــــ تم عورت ہو کہ پٹاخہ ـــــــ پٹ پٹ بولے ہی جاتی ہو تمہیں تقریر کرنے تو نہیں بلایا تھا ـــــــ"

"تو گانا سنیئے ـــــــ رقص دیکھئے ـــــــ لیکن جو میری راہ نہیں اُسی پر نہ چلوائیے ـــــــ"

سکندر ذرا کمینے پن سے ہنسا —— "یہ ساری باتیں یہاں تک تو ٹھیک ہیں لیکن اگر میں یہ کہوں کہ تم اتنی رات گئے ایسی تنہائی میں ایک مرد کے ساتھ اکیلی ہو — تو ؟؟"

اس نے ادا کے ساتھ مصرع پڑھا ؂

"عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

یہ آپ اچھی طرح سوچ رکھیں کہ میں ایک ہی نظر میں بھانپ لیتی ہوں کہ کون مرد کس قماش کا ہے ؟ اور جب مجھے خطرہ نظر آئے تو میں تنہا قدم نہیں اٹھاتی —— آپ کا رویہ کیسا بھی سہی ، میں رنڈی سہی ، تنہا سہی ، لیکن اتنا پھر بھی یقین ہے کہ آپ دست درازی نہیں کریں گے —— مجھے خون کی پہچان ہے ——" وہ صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔

"نیند ہے کہ کم بخت آئے جا رہی ہے اور آپ ہیں کہ بس —" اس نے ہنس کر انگڑائی لی ——

سکندر نے سنئے سنئے روٹھے ہوئے دولہے کی طرح منہ پھیر لیا ——

چاندنی نے بغیر ساز کے ، ایک گھریلو سی لوری گنگنانی شروع کر دی —— سکندر کے اندر کا سرکش مرد میٹھی میٹھی مدھر تان سنتا سنتا سونے پر آ گیا ——

ہیں —— ہاں —— ہاں —— اوں —— آں —

باہر سے پھر اسی مریل سی آواز نے مداخلت کی اور سکندر سوتا سوتا پھر اٹھ گیا اور اب کی بار ایسا جھلایا کہ دروازہ کھول کھٹاک سے باہر —— واپس پلٹا تو اس کے ہاتھوں میں چیں چیں کرتا ایک چھوٹا سا بچہ تھا ، وہ تیزی سے اسے لیے لیے اندر گھس رہا تھا کہ چاندنی تیزی سے بھاگ کر اس کی راہ میں آ گئی ۔

"غصے میں مار ہی ڈالیں گے کیا آپ ——؟"

"نہیں اماں بی کے حوالے کر رہا ہوں، یا تو اسے سنبھالیے یا اپنے ہاتھوں مار ڈالیے —— قسم خدا کی کوٹھیوں میں یہ آوٹ ہاؤسس والا سسٹم ہونا ہی نہیں چاہیئے —— اور پھر ان کم بختوں کو اتنی تمیز بھی تو نہیں کہ دور سے جا کر بہلائیں —— یہیں میری ناک کے پاس ہی لے کر ٹہلیں گے ......"

ڈر سے کانپتا، مگر محبت سے مجبور ماں اسی دم کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا اور روتا ہوا بولا۔ "کا کریں سرکار۔ گھر والی کو مرے دن ہی کتے ہوئے ہیں۔ بچہ ہی کی تو بات ہے۔ نہ اوپر کا دودھ منہ میں پکڑے نہ بہلائے بہلے —— ہم تو مجبور ہو گئے۔ بے چاری دھوبن بہلائے تو ذرا اوپہ سو جائے۔ تنک سو کر وہی ٹھاں ٹھاں ہے۔ ہم تو ہار گئے۔"

"ہار گئے ہو تو اسے زہر پلا کر ختم کر دو —— یا پھر لے جاؤ بڑی بیگم صاحب کے پاس، وہی کچھ بندوبست کریں گی" ——

اس نے گیند کی طرح بچے کو اچھالا —— لے جاؤ یہاں سے ؟ —— اک دم چاندنی نے بچہ کو ہاتھوں پر جھیل لیا —— ڈرے ہوئے بچو ہے جیسے ہچکنے اور زور سے چیخیں مارنی شروع کر دیں —— جس کمرے کو رقص و سرود سے، پائل کی جھم جھم اور مدھر تانوں سے گونجنا تھا، وہاں بے وقت کی بھیرویں ہو رہی تھی —

جب اس کی روں روں کسی طرح نہ رکی تو چاندنی نے اسے سفید سفید بانہوں میں بے حد ماہرانہ انداز سے جھکولے دیئے اور صوفے کے ایک کونے پر ٹک کر اپنے بلاؤز کے بٹن کھول کر بے حد محبت اور پیار کے ساتھ اپنی گوری اور

تنی ہوئی چھاتی اس کے منہ سے لگا دی۔ سکندر نے حد درجہ حیرت کے ساتھ دیکھا۔
"ا ا ر ر ر ...... تم — ؟ تم تو — غالباً کنواری ہو۔ تمہارے دودھ اترے گا!
اور پھر تمہارا حسن ! ناف تک ڈھلک نہ جائے گا — ؟؟ اور تمہارے ....."
چاندنی نے بات کاٹ دی۔ "تم کیسے مسلمان ہو — تمہیں بی بی مریم کی داستان بھی
نہیں معلوم — ؟؟ خدا بغیر شوہر کے بچہ دے سکتا ہے تو بغیر بچے کے دودھ کیوں
نہیں دے سکتا ؟؟"

سکندر نے حیرت سے دیکھا۔ دیکھتا ہی رہا۔ اس وقت چاندنی کے چہرے
پر دنیا بھر کی ماؤں کا نور ایک ساتھ جھلک رہا تھا۔

احمد ندیم قاسمی

سردر گھر میں داخل ہوا تو ایک بہت بھاری خبر کے بوجھ سے اس کی کمر ٹوٹی جا رہی تھی اور اس کی رگیں پھول رہی تھیں جیسے ساری باتیں اس کے حلق میں آکر اٹک گئی ہوں۔ اس کی بہت اندر تک دھنسی ہوئی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ ہونٹ کھلے ہوئے تھے کیوں کہ بات شروع کرنے سے پہلے بند ہونٹوں کو کھولنے کا وقفہ خبر کے بھاری پن میں خارج ہو سکتا تھا۔

"اماں"

وہ چھپر تلے بیٹھی ہوئی بڑھیا کو دیکھ کر پکارا اور اس کے قریب پہنچنے تک بولتا ہی چلا گیا:

"وہ برساتی نالے سے پرلے محلے میں جو لڑکی رہتی تھی نا، بیگماں؟ جسے پہلی بار دیکھ کر تم نے بے ساختہ کہا تھا کہ چاہے تو بڑے ٹھاٹ کی کنجری بن سکتی ہے....؟"

"ہاں ہاں" بڑھیا پیڑھی سمیت اچھل کر ایک قدم آگے آگئی اور سردر نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اپنے بیان کو جاری رکھا۔

"وہ جو تمہارے خیال میں بیٹی کمال خاتون سے ہو بہو ملتی ہے!" اس نے

کنکھیوں سے کمالاں کی طرف دیکھا جو چولہے کے پاس اُپلوں کے دھوئیں میں لپٹی ہوئی بالکل ایک پرچھائی سی معلوم ہو رہی تھی۔ بڑھیا نے خاموشی کے اس خلا کو پُر کیا "ہو بہو کہا تھا ئیں نے؟ ہماری کمال خاندان جیسی آنکھیں اس کے نصیبوں میں کہاں۔ یہ آنکھیں تو سمندر ہیں۔ شمشاد اور نو بہار کی آنکھیں سارے ملتان میں اپنا جواب نہیں رکھتیں پر ہماری بیٹی کی آنکھوں کے سامنے وہ آنکھیں بھی پانی بھریں۔ اور پھر ہماری کمالاں کے اُوپر کے ہونٹ کی محراب اور نیچے کے ہونٹ کی کمان! میرا تو کتنی بار جی چاہا کہ ہندو عورتوں کی طرح اپنی کمالاں کی ہر صبح آرتی اتارنے لگوں۔ بیگماں اچھی ہے بات چیت، چال ڈھال ہیں قدرت نے بڑا نفیس اور بہت اونچے درجے کا رنڈی پنا بھر دیا ہے۔ پر ہماری کمالاں جیسا سجاؤ کہاں اس میں۔" بڑھیا کی باتوں کے دوران سرور اسی طرح کنکھیوں سے کمالاں کو دیکھتا رہا اور کمالاں جلے ہوئے اپلوں میں سینا ٹھونس ٹھونس کر ہر طرف پھوہڑ پن سے آگ بکھیرتی رہی اور جب بڑھیا ڈلی پھانکنے کو رکی تو ٹوٹے تار کو سرور نے بڑی پھرتی سے جوڑا۔

"تو اماں۔ وہی بیگماں رات کو اس مشہور نیزہ باز زمیندار کے ساتھ بھاگ گئی جس کے۔۔۔۔" بڑھیا پیڑھی سمیت اچک کر سرور کے گھٹنے سے آ ٹکرائی۔

"بھاگ گئی؟ اے سبحان اللہ، میں نہیں کہتی تھی؟ شاباش ہے اس کے دادے پردادے کو، اور لعنت اس کے باپ پر جو اسے سکول کے سوکھے جڑے لڑتے جڑے منشی کی ہڈیوں سے باندھنے چلا تھا۔ واہ! کس کے ساتھ بھاگی؟۔۔۔۔۔۔"

بڑھیا نے کمالاں کی طرف دیکھا جو بجھے بجھے چولہے میں مسلسل پھونکے مارے جا رہی تھی اور کڑوا رلا دینے والا دھواں بہت گاڑھا ہو رہا تھا۔ سرور بولا:

"اس زمیندار کے ساتھ جس کے بارے میں تم نے ہی کہا تھا کہ تصویر اتار نے والی مشین کے سامنے بیٹھ کر اسے آنکھ بھر کر دیکھے تو مشین کا شیشہ تڑ سے ہو جائے۔!

اب کے بڑھیا پیڑھی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹہلتی ہوئی بولی :

"معلوم ہوتا ہے شیرنی کا دودھ پیا تھا بیگماں نے۔ بھئی سرور بیٹے، ایسی ہی لڑکیوں کے دم سے دنیا کی بہار قائم ہے۔ ورنہ ان شریف زادیوں کا بس چلے تو دنوں میں گاتی گنگناتی دنیا کو قبرستان بنا کر رکھ دیں۔ ہاہاہا۔ لگتا ہے میں دس برس اور جیوں گی۔ رگوں میں خون ناچنے لگا ہے۔ جیو میرے سرور، کیسی گھی میں تر تراتی خبر لائے ہو تم۔ کیوں کمالاں بیٹی ؟ تمہارا کیا خیال ہے ؟"

اور کمالاں نے ہنڈیا کو چولہے پر سے کچھ ایسا جھٹکا دے کر اٹھایا کہ چلو بھر دال اچھل کر اپلوں پر گری اور سانپ کی طرح پھنکار کر رہ گئی۔ بڑھیا نے مسکرا کر سرور کی طرف دیکھا اور سرور مسکرا کر بولا :

"کچی ہے ابھی "

کمالاں کو دروازے پر ٹھٹکتے دیکھ کر بڑھیا فوراً بولی :

"دال نا۔ ؟"

اور جب کمالاں ہنڈیا لیے اندر چلی گئی تو دونوں ماں بیٹا منہ پر ہاتھ رکھے کھنکنے لگے اور پھر سرور نے افیم کی ایک گولی کی دو گولیاں بنا کر ایک کو بڑھیا کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔" ہاں،" وہ بولی " آج ہی تو سانولی رانی کو چکھنے کا مزہ آئے گا "

یہ تنتناتی ہوئی خبر کمالاں کے لئے نئی نہیں تھی۔ اس کا باپ اور دادی تقریباً روزانہ اسی قسم کی خبریں ڈھونڈ ڈھانڈ لاتے تھے اور انہیں کمالاں کے سامنے

،،کچھ یوں مزے سے لے کر بیان کیا جاتا کہ بعض وقت تو کمالاں تک چونک کر پوچھ بیٹھتی تھی :- "پھر کیا ہوا بابا؟" اور جواب میں بابا کہتا " پھر کمال ہوتا بیٹا! پھر کیا ہوتا تھا؟ لڑکی نے گاؤں بھر کے سامنے اکڑ کر کہہ دیا کہ وہ اپنی یاری نہیں توڑے گی وہ اپنے بھائیوں کا حلقہ توڑ کے بھاگی اور اپنے یار سے چمٹ کر رہ گئی - ہیر کو تو وارث شاہ نے خامخواہ اچھال دیا ہے - میں اس نگری کا بادشاہ ہوتا تو اس لڑکی کا وظیفہ لگا دیتا - اماں کی قسم ،،______ کمالاں یہ باتیں سُن کر جھینپ جاتی پھر سونے سے پہلے بستر پر کروٹوں کے درمیان سوچتی اور سوچتے سوچتے کبھی اس پر چھاج بھر بتاسے برس پڑتے کبھی چولہا بھر انگارے -

کمالاں کا دادا سہراب خان گاؤں کا خاصا کھاتا پیتا دوکاندار تھا - کہتے ہیں . پنجاب کا لاٹ سر میلکم ہیلی جب اس گاؤں میں ٹڈیوں کے انڈے دیکھنے آیا تھا تو سہراب خان نے لاٹ صاحب کے سامنے گاؤں کے کُنوئیں میں کھانڈ کی اکٹھی بیس بوریاں انڈیل دیں اور اگلے سال خان صاحب کا خطاب پایا - مگر جاتے اس پہ کیا افتاد پڑی کہ یہ خان صاحبی اسے بڑے بڑے شہروں میں لے گئی اور ایک روز گاؤں والے کیا دیکھتے ہیں کہ خان صاحب سہراب خان پچاس برس کی عمر میں ایک نئی بیوی سے لئے گاؤں میں داخل ہو رہا ہے - کھُسر پھُسر ہوئی مگر سارے گاؤں کی ایک ٹھاٹ دار عورت شکوک و شبہات کو بہا کر لے گئی - البتہ ایک برس کے بعد جب نئی بیوی کے بطن سے سرور پیدا ہوا تو دایہ نے ایک عجیب ہوائی اڑا دی یہ دایہ بھی کسی زمانے میں ملتان ہی سے بیاہ کر آئی تھی - اُس نے شوشہ چھوڑا کہ سہراب خان کی یہ نئی بیوی تو ملتان کی مشہور طوائف نرتناج ہے - جو وہاں ناچے کے

نام سے مشہور تھی اور بلوچستان کے بیتی وڈیروں اور سندھ کے کئی جاگیرداروں کے پہلو گرما چکی تھی - میں نے تاجی کو نواب رن مست کی حویلی میں ناچتے دیکھا ہے لوگو!" دایہ جگہ جگہ یوں چلاتی پھری جیسے اس راز کو فاش نہ کیا تو اس کا دم گھٹ جائے گا۔" اپنی اولاد کی قسم کھاتی ہوں کہ یہ خان صاحبنی وہی تاجی ہے "کنجری" اور یہ لفظ سارے گاؤں میں گونج گیا۔ "کنجری - کنجری" اور پھر سہراب خان کی دوکان اُجڑ گئی، وہ دوکان کا سامان اٹھوا کر گھر میں روپوش ہو گیا۔ پائی تک کا محتاج ہو گیا اور رات کی رات گاؤں سے بھاگا اور کہتے ہیں کہ لائل پور میں کسی وکیل کا منشی ہو گیا اور سرور ابھی دس برس ہی کا تھا کہ خان صاحب سہراب خان اپنے گاؤں والوں کو گالیاں دیتا چل بسا - تاجی سرور کی انگلی پکڑے پھر سے گاؤں میں آئی اور سیدھی بھری چوپال میں داخل ہو گئی - کہتے ہیں کہ اُس نے رو رو کر گاؤں والوں کے سامنے ایک تقریر کی اور قسمیں کھا کھا کر کہا کہ وہ کنجری ضرور تھی مگر برسوں سے توبہ کر چکی ہے - اب وہ ایک دکھی بیوہ ہے اور خدا کے بعد یہ دس برس کا لڑکا اس کا سہارا ہے - کیا یہ گاؤں جس پر اس کے ابا کے بے شمار احسان ہیں - انہیں اپنے گھر میں سر چھپانے کی اجازت نہیں دے گا - ؟"

لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں فیصلہ کیا کہ کوئی خاص حرج نہیں ہے - تاجی نے گاؤں میں کوئی دس برس بڑے امن سے کاٹے اور وہ بڑے پُر امن طریقے سے نوجوانوں اور نو عمر لڑکیوں کے درمیان یاروں، دوستوں کے تانے بانے بُنتی رہی - اپنا پیٹ پالتی اور نشہ پورا کرتی رہی

پھر جب سرور جوان ہوگیا تو اس کے لئے کسی اور گاؤں میں ایک غریب سی لڑکی چن لی بیاہ ہوا اور سال بھر کے بعد کمال خاتون پیدا ہوئی مگر زچگی کی حالت میں سرور کی بیوی مرگئی ۔ وہ لٹا لٹا سا رہنے لگا اور پھر نہ جانے اس کے من میں کیا سمائی کہ چند روز بعد ہی گاؤں چھوڑ کر ملتان بھاگ گیا ۔ تاجی کمال خاتون کو مختلف ماؤں کے ہاں لیے پھری کہ وہ اسے چند مہینے دودھ پلادیں اور اس کی دعائیں لیں ۔ لیکن اس دوڑ دھوپ میں اسے معلوم ہوا کہ وہ تو اب تک کنجری ہے ، ایک رات کمال خاتون کو ایک کپڑے میں لپیٹا اور گاؤں کے مولوی صاحب کے دروازے پر رکھا اور گاؤں سے بھاگ گئی ۔

پانچ چھ برس تک ماں بیٹا ملتان میں کوکین کی تجارت کرتے رہے ۔ چنڈو خانے بھی کھول لیے اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے چرس لا لا کر بیچتے رہے ۔ مگر سرور ایک بار چرس لاتے ہوئے پکڑا گیا اور ایک برس کے لیے جیل چلا گیا ۔ تاجی سے کاروبار سنبھل نہ سکا اور جب سرور جیل سے رہا ہوا تو وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ بہترین تجارت لڑکیوں کی ہے ۔ ایک لڑکی بھی چکلے میں بٹھانے کو مل جائے تو اس کی آمدنی سے چاہو تو موٹر تک خرید لو ۔ وہ ایک سال تک سارے پنجاب میں کسی آوارہ لڑکی کی تلاش میں بھٹکتے رہے مگر کوئی بھی ان کے ہتھے نہ چڑھی ۔ آخر ایک روز جلال پور جٹاں کے ایک ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے تاجی کا نوالہ اس کے منہ تک جاتے جاتے رُک گیا اور وہ بولی :

" سرور بیٹے ! وہ ہماری کمال خاتون اگر زندہ ہوئی تو اب وہ کتنے برس کی ہوگئی ہوگی ۔ ؟ "

سرور ہڈی سے گودا نکالنے کی کوشش میں تھا۔ چونک کر بولا: "ارے! آخر تم نے پہلے کیوں یاد نہیں دلایا اماں؟ وہ تو اب یوں سمجھو کہ کوئی سات آٹھ برس کی ہو گی یا پانچ چھ سال کے اندر اللہ نے چاہا تو ـــــ" اور اس نے زور سے چٹکی بجائی۔ تاجی نے کھانا وہیں چھوڑ دیا اور کمالاں کی یاد میں رونے لگی۔ ماں بیٹا افیم کی کافی مقدار شہر بہ شہر تولہ تولہ کر کے خریدتے ہوئے اپنے گاؤں میں آئے تو مولوی نے خدا کا شکر ادا کر کے آٹھ برس کی کمالاں ان کے سپرد کر دی اور جب روتی چلاتی کمالاں گھر میں آتے ہی مصلا بچھا کر نماز پڑھنے لگی تو بڑھیا اور سرور مکان کے ایک گوشے میں جا کر منہ پر ہاتھ رکھے دیر تک گنگتے رہے۔ "پیڑ کا رخ غلط ہے تنے میں رسا ڈال کر اسے سیدھا کرنا پڑے گا۔"

تنے میں بار بار رستہ ڈالا گیا۔ مگر کچھ ہی دیر بعد پیڑ جھک جاتا اور رستہ تڑ سے ٹوٹ جاتا۔ پیڑ کا رخ متعین ہو چکا تھا۔ کئی بار تو ماں بیٹا مایوس ہو کر کمالاں کو پھر سے مولوی صاحب کے حوالے کر کے ہمیشہ کے لئے ملتان جانے کا فیصلہ کر لیتے۔ مگر پھر کمالاں سر پہ گھڑا رکھے آنگن میں داخل ہوتی اور بڑھیا کہتی:

"دیکھ دیکھ سرو بیٹے اس میں بڑھتی ہوئی قیامت کو۔ قد کیسا بوٹا بوٹا سا ہو رہا ہے اور چال میں کیسی مستی ہے۔ ہونٹ دیکھو، لگتا ہے اللہ نے اپنے ہی ہاتھ مبارک سے تراشے ہیں اور آنکھیں! یہ تو سمندر ہیں۔ ملتان کا ملتان ڈوب مرے گا ان میں، اس روز چکی پیس رہی تھی اور ساتھ ساتھ گا بھی رہی تھی۔ تمہارے سر کی قسم میں سمجھی کلکتے والی گوہر جان پھر زندہ ہو گئی۔ آواز میں وہ قدرتی مرکیاں اور تھرتھریاں ہیں کہ میں کہتی ہوں ہزار ماسٹروائس چالیس چالیس پچاس پچاس ہزار میں ایک

ایک ریکارڈ بھروائے گا اس سے اور وہ بھی ناک سے لکیریں نکال کر۔ میں تو نہیں جاؤں گی ملتان۔ میں تو اس کو لے کے جاؤں گی وہاں۔"

کمالاں کا بلوغ بالکل عید کا چاند ہو کر رہ گیا تھا۔ اگرچہ مصلا پھٹ جانے کے بعد دوسرا مصلا مہیا نہ ہو سکا۔ مگر کمالاں دن میں ایک دو بار اپنی کسی دھلی ہوئی چادر یا چولے پر نماز پڑھ ہی لیتی تھی پھر یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ شروع شروع میں دادی اور ابا کی باتیں سن سن کر یوں چلا اُٹھتی تھی جیسے نیند میں ڈر گئی ہو۔ کئی بار اس نے مولوی صاحب سے شکایت کر دینے کی دھمکی دی مگر دادی نے اُسے سمجھایا: "تم نہیں جانتیں بیٹا۔ جب تم خود بھی بڑی ہو جاؤ گی نا تو ایسی ہی باتیں کرو گی۔ خود مولوی صاحب بھی ایسی ہی باتیں کرتے ہوں گے۔ بچپن میں تم گڑیا سے کھیلی ہو گی مگر اَب تو نہیں کھیلتیں نا؟ آج سے دو سال پہلے تم کنوئیں سے ایک ذرا سی گگریا بھر کر لا سکتی تھیں۔ آج دو گھڑے سر پر رکھے ہرنی کی سی قلانچیں بھرتی ہوئی آتی ہو۔ تو یہ دنوں کا پھیر ہے میری جان پھر اَب چند مہینوں ہی میں تم دیکھو گی کہ تمہیں راتوں کو نیند نہیں آتی۔ جاگنے میں تمہیں مزہ آئے گا اور تم اندھیرے میں کچھ ٹٹولنے کی کوشش کرو گی اور کچھ نہ پا کر اداس ہو جاؤ گی۔ سمجھ گئیں میری رانی! بس اَب چند مہینوں کی بات ہے۔"

"بس اَب چند مہینوں کی بات ہے۔" بڑھیا سرور کو اطلاع دیتی۔

اور سرور ناک بھوں چڑھا کر کہتا۔ "یہاں ایک ایک دن مہینہ بن رہا ہے اور تم کہتی ہو بس اب چند مہینوں کی بات ہے۔ تم بھی کمال کرتی ہو اماں۔ ذرا سا افیم کا کاروبار چل رہا تھا پر یہ پولیس اور آبکاری والے بہت دُور دُور کی بُو

سونگھنے لگے ہیں۔ جس کے ہاتھ بھی افیم بیچتا ہوں، وہ پولیس کا مخبر لگتا ہے مہینے میں کُل پندرہ بیس کی بکری ہوئی ہے۔ اب یہ بتاؤ ان پندرہ بیس میں ہم دونوں اپنا نشہ پُورا کریں یا کھائیں پیئیں اور اوڑھیں پہنیں ۔ ویسے بھی کچھ مولا یا سا رہتا ہوں ۔ سوچتا ہوں کمالو چکلے کے لائق نہیں، اس کی آنکھوں میں جو سادگی کی چمک ہے نا اماں ۔ وہ نہ میں نے تمہاری شمشاد میں دیکھی ہے نہ نو بہار میں "

بڑھیا بیٹے کی باتیں سن کر ہنس دیتی ۔ " ارے پگلے ۔ کہیں تو بھی مولوی تو نہیں بنا جا رہا۔ یہ سادگی کی چمک کس کی آنکھوں میں نہیں ہوتی، مگر غائب ہو جاتی ہے۔ بجھے ہوئے چراغ دیکھ کر یہ تو سوچا کرو کہ یہ بھی جلا اور چمکا ہوگا۔ پگلا لا آج کی افیم لا "

دونوں کمالاں کی جوانی کو یوں تک رہے تھے جیسے چائے کی کیتلی کو چولہے پر رکھ کر پانی کے اُبلنے کا انتظار کیا جاتا ہے اور یہ پانی اس روز اُبلا جب کنوئیں پر جاتی جاتی ہوئی کمالاں کو ایک کسان قادرے نے چھیڑ دیا ۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا اور جب کمالاں کا پاؤں کسی گڑھے یا کنکر پر پڑتا تو وہ کہتا "حسبی اللہ، حسبی اللہ"، کمالاں بہت دیر کے بعد اس دعا بہ کلمے کی تکرار سے چونکی ۔ پلٹ کر بولی ۔" اپنی بہنوں کو جا کر چھیڑ"، نوجوان مسکرا کر بولا " میرے تو سب بھائی ہی بھائی ہے مہربان" کمالاں نے کڑک کر کہا ." تو پھر اپنی ماں سے عشق لڑا"، نوجوان ہنس کر بولا، وہ تو مر چکی ہے پیارو "، کمالاں آپے سے باہر ہو گئی قادرے کو وہ بے بھاؤ سنائیں کہ آن کی آن میں کنوئیں کی جگت خالی ہو گئی ۔ لڑکیاں کمک کو بھاگی آئیں ۔ قادرا لپک کر دور نکل گیا اور وہاں سے پکارا ۔" آخر کنجری ہونا کنجری "؛ ــــ وہ

لڑکیاں جو مارے ہمدردی کے کمالاں کے پاس جمع ہو گئی تھیں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائیں گنگنیں اور پھر زور زور سے قہقہے مارنے لگیں۔ کمالاں نے گھڑے زمین پر دے مارے اور روتی چلاتی واپس گھر آگئی۔ پہلے دیر تک بلک بلک کر روتی رہی۔ پھر دادی اور ابا کی تسلیوں کے سہارے آنسو پونچھ کر بڑی رقت اور سوز سے سارے حادثے کی کیفیت بیان کی اور جب آخر میں غصے میں گھڑے توڑ دینے کا ذکر کیا تو دلاسر ابا نے کی خاطر دادی کو دیکھا اور دادی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ حیران ہو کر ابا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ذرا غصہ تھا۔ جو آنکھیں ملتے ہی کافور ہو گیا اور جب بڑھیا نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"چراغ بہت بُری طرح بھڑک اُٹھا ہے سرور بیٹے!" تو دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔

اس روز سے کمالاں ایک دم سے بدل گئی۔ کنوئیں پر جا کر گھر میں سُنی ہوئی باتیں ایسے جوش سے سُناتی جیسے کسی سے انتقام لے رہی ہو۔ نو عمر لڑکیاں سُنتیں لیکن جھینپ جھینپ جاتی اور بڑی بوڑھیاں ایک دوسرے کے کانوں پر منہ رکھ کر کہتیں: "آخر کنجری ہے نا کنجری" یہ سب کچھ سُن کر بھی کمالاں کے تیور نہ بدلتے اور وہ اغواء اور آشنائیوں کی کہانیاں بڑے ٹھسے سے سنائی جاتی۔ گھر آتی تو دادی اور ابا سے نئی خبریں سنانے کا تقاضا کرتی اور منہ کھول کر بڑی بے حیا ہنسی ہنسنے کی کوشش کرتی۔ بڑھیا تاجی اور سرور یہ آثار دیکھ کر خوش ہوتے اور جب کمالاں سو جاتی تو بہت رات گئے تک مستقبل کے بارے میں باتیں کرتے رہتے: " ہولے ہولے ایسی سدھائی ہے کہ ملتان پہنچے گی تو دوسری

بڑی بڑی شاندار کنجریوں کے کلیجے دھک سے رہ جائیں گے ۔ دیکھ لینا بیٹیا " بڑھیا ہوائی قلعے تعمیر کرتی رہتی ۔ ان قلعوں کے دریچوں میں بیٹھی ہوئی بنی ٹھنی کمالاں اسے ہنستی مسکراتی ، اشارے کرتی اور آنکھیں مارتی نظر آتی اور پھر وہ بے قرار ہو کر اُٹھتی ۔" اے ہے کیسا جی چاہ رہا ہے اپنی رانی بیٹیا کو ایک نظر دیکھنے کے لئے " وہ سوتی ہوئی کمالاں کے پاس آکر اسے مسکرا مسکرا کر بڑے غور سے دیکھتی پھر اس کی ایک لٹ کو اس کے چہرے پر ڈال کر بیٹے کو پکارتی " ذرا ادھر تو آنا سرور بیٹے، دیکھنا تو اپنی بیٹی کو ، تیری قسم اگر میں مرد ہوتی تو تیرے سامنے دس ہزار روپے رکھ کر اس کی مینڈھی کھلواتی " پھر وہ اس کی بلائیں لیتی اور رات بھر موٹروں ، گدگدے بستروں اور کوکین کے نشوں کے خواب دیکھتی رہتی ۔

لیکن کمالاں ایک روز پھر سے بدل گئی ۔ کسی نے اسے بتایا کہ جس قادرے نے اسے چھیڑا تھا ۔ وہ ایک اور نوجوان کے ہاتھوں پٹ گیا ہے ۔ کمالاں پر اس خبر نے کوئی خاص اثر نہ چھوڑا مگر جب کہنے والی نے کہا کہ تیرے نام پر لڑائی ہو گئی قادرا تیرے بارے میں ننگی ننگی باتیں کر رہا تھا کہ ایک دم ابراہیم اس پر ٹوٹ پڑا اور دھنک کر ڈال دیا اسے ۔ ابراہیم کو تو تم جانتی ہو نا ؟ ارے یہی ابرو فوجی " تو کمالاں کو گھمری سی آگئی ۔ اور اس کے بعد وہ احساسِ جمال اور احساسِ محبت کی سنجیدگی میں لپٹی رہنے لگی ۔ ماں بیٹا کمالاں کے کردار کی اس دھوپ چھاؤں سے گھبرا سے گئے ۔ لیکن اپنی ریاضت میں کمی نہ آنے دی ۔ افیم کی گولی ذرا سی موٹی ہو گئی اور جماہیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا مگر کمالاں کی چرائی پر تکیہ لگائے رکھا کمالاں بھی اب منہ پھاڑ کر نہیں ہنستی تھی ۔ اور ان سے لڑکی کی حرکتوں اور لڑکے

کی شکل وصورت کے بارے میں کرید کرید کر نہیں پوچھتی تھی ۔ تو گھی میں ترتراتی خبریں سُن سُن کر رونی اور جھلاتی بھی نہیں تھی ۔ ایک روز ابراہیم فوجی کو گلی میں جاتے دیکھ لیا تو بغیر سوچے سمجھے مسکرانے لگی ۔ جواب میں ابراہیم بھی مسکرایا تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر گھر آگئی ۔ رات کو جب حالات کا جائزہ لینے کے بعد سرور اور بڑھیا سونے لگے تو انہوں نے مدتوں کے بعد کمالاں کو" رگی" میں گاتے سُنا ۔ دونوں ایک ساتھ بستروں سے اُٹھ بیٹھے اور دم سادھے اس کا گیت سُنتے رہے ۔ اور جب گیت ختم ہوا تو بڑھیا نے چپکے سے کہا ۔" تمہاری ہی قسم بیٹا، چوٹ لگی ہے ٹھاق چوٹ لگی ہے ۔ چوٹ نہ لگے تو آواز میں پینگوں کا سا یہ اتار چڑھیاؤ مشکل ہی سے آپاتا ہے، ہاہا ہا لطف آگیا ۔ !" امیدوں کے پھول جنہوں نے اب تک سر نیہوڑا لیا تھا تر و تازہ ہو کر سربلند ہو گئے ۔ اور کمالاں کی آواز کے ہلکوروں میں جھومنے لگے ۔

ہولے ہولے جب تقریباً روزانہ کمالاں اور ابراہیم آپس میں مسکراہٹوں کا تبادلہ کرتے لگے تو اسی رفتار سے گھر کے معاملات میں کمالاں محتاط ہوتی گئی ۔ یہ وہ دن تھے جب گھر میں پتلی دال پکنے لگی ۔ دادی سارا دن پیڑھی پر بیٹھی افیم کی پینک میں گم رہتی تھی یا کبھی کبھار قصبے سے سرور کی لائی ہوئی چھالیا کترتی اور پھانکتی چباتی رہتی ۔ اور سرور موچیوں، جولاہوں کی دوکانوں پر بیٹھا افیم بیچتا اور نت نئی خبریں سن کر اور اکثر گھڑ کر گھر لاتا ۔ ماں بیٹا صرف اسی وقت باہر کی خبروں پر تبصرہ کرتے جب تک کمالاں بھی کہیں آس پاس موجود ہوتی ۔ پھر بڑے جہاندیدہ بن کر کمالاں کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتے اور رات گئے تک اس کی پلکوں کے بار بار جھپکنے کے معانی

اور سینے پر بار بار دوپٹے کو پھیلانے کے اسرار و نوافل پر مغز ماری کرتے سو جاتے لیکن اب تک ان میں کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی تھی کہ کمالاں سے براہ راست اور دو ٹوک انداز میں عصمت فروشی کے لئے کہتے بس جال بچھاتے رہے دانہ ڈالتے رہے اور انتظار کرتے رہے۔ مگر چڑیا کو دانے کی ہوس ہوتی تو جال میں پھنستی بعض وقت سرور تنگ آکر کہتا۔ "اماں! اس حرامزادی کو اٹھا کر ملتان میں لے جائیں، ایک بار شمشاد، نو بہار اور امیر وغیرہ کے چکلے میں بیٹھی تو سارے نشے ہرن ہو جائیں گے۔ مگر بڑھیا ناجی دور اندیشی سے کہتی " نہیں بیٹا! وہاں جا کر یہ خود ہرن ہو گئی تو کیا کریں گے؟ ابھی کچی ہے ناپک جانے دو، آپی آپ ٹپکنے دو اور پھر تم پولیس کو نہیں جانتے تھانیدار آنکھوں آنکھوں میں ڈاکرٹی کر لیتے ہیں۔ انہیں اگر پتہ چل گیا کہ کمالاں پورے چودہ کی بھی نہیں تو میری اور تیری باقی عمریں جیل میں کٹ جائیں گی۔ جہاں آٹھ دس برس انتظار میں گزارے ہیں وہاں چند مہینے اور سہی، آخر اپنی بیٹی ہے کوئی غیر تو نہیں کہ کان سے پکڑ کر لے جائیں۔ بیٹھے بیٹھے نہ بیٹھے، یہاں تو عمر بھر کا ساتھ ہے، نسلوں کا نصیبہ کھل جائے گا میرے لال ذرا سا اور دیکھ لو۔"

ایک روز سرور گھر آیا تو تھکا ماندہ سا بڑھیا کی پیڑھی کے پاس بیٹھ گیا اور بولا "کچھ نہیں اماں، لطف نہیں آیا۔"

بڑھیا بولی "میں پہلے سمجھ گئی تھی کہ سرور بیٹا خالی خالی سا آرہا ہے۔"

سرور نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کنپٹیاں دبائیں اور بولا۔ "گلابی اور نواز میں بڑی مدت سے یارانہ چل رہا تھا۔ میں تو رفتار سے پہچان لیتا ہوں کہ کلیجے میں کتنا گہرا

گھاؤ ہے ۔ لوگ یقین نہیں کرتے تھے نہ کہتے تھے ۔ نواز نمازی ہے اور آنکھیں جھکا کے چلتا ہے ۔ اس پر ہم شبہ کیوں نہ کریں اور اس سے کیوں نہ کہیں کہ بھئی یہ نیچی نظر تو بڑی خطرناک ہے ۔ نظریں اٹھا کر چلا کرو ۔ سو آج میں گگّے جولاہے کے ہاں افیم بیچ کر آ رہا تھا کہ سلطانے کے کھنڈر کے پاس مجھے گلابی نظر آئی چھپنے کی کوشش میں تھی پر میں نے دیکھ لیا اور جو میں کھنڈر کی دیوار پر سے جھانکتا ہوں تو اندر یہ نمازی نواز دبکا بیٹھا ہے ۔ اور جو پھر پلٹ کے دیکھتا ہوں تو گلابی گاؤں میں داخل ہو رہی ہے ۔ میں نے نواز سے صرف اتنا کہا ۔ "کیوں پیارے نماز پڑھ رہے ہو ۔ ؟" مجھے من بھر کی گالی دیکر چاقو نکال لیا اور بولا "یہ کوئی تیرے باپ سہراب کا کھنڈر ہے ۔ ؟" پر اماں ! جھینپ چھپائے سے چھپتی تو نہ ہیر بدنام ہوتی نہ سوہنی ۔ خیر میں نے واپس آ کر موچی کی دوکان پر ذکر کیا تو سب نے مجھے جھوٹا قرار دیا ۔ میں نے پیر دستگیر کی قسمیں کھا کھا کر کہا کہ میں نے ابھی ابھی دونوں کو اکٹھے دیکھا ہے ۔ کہ ایک دم جیسے دوکان پر اُلّو بول گیا سامنے یہی گلابی ہاتھ میں جوتا لیے کھڑی ہے ۔ "اسے کل تک مکمل کر دو بھائی" اس نے موچی سے کہا اور جوتا پھینک کر چل دی ۔ ایسی بھد ہوئی ہے اماں جی چاہتا ہے کہ زمین پھٹے اور اس میں سما جاؤں ۔ بڑے آئے سچی یاری لگانے والے ، چھپ چھپ کے ملتے ہیں اور ــــــــــ حرامزادے !"

اور کمالاں نے سوچا کہ آخر ابا کو ان کے چھپ چھپ کر ملنے سے کیا تکلیف ہوتی ہے ۔ وہ ملتے ہیں تو ابا کا کیا جاتا ہے ؟ یہ تو نہیں کرتے کہ کمر سے چادر کھول کر سر پر رکھ لی اور عشق کا نام بدنام کیا ۔ پھر اچانک وہ خیال ہی خیال میں سلطانہ

کے کھنڈر میں گلابی کے روپ میں جا پہنچی جہاں ابراہیم نواز کے روپ میں بیٹھا اس کی راہ دیکھ رہا تھا اور پھر ـــــ

بڑھیا کی آواز نے اس کو چونکا دیا۔ "جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا؟ عشق کماتے پھر رہے ہیں ماں کے لاڈلے، دھن ہو بیگماں جس نے بھائیوں کا حلقہ توڑ کر اپنے یار کے سینے پر سر رکھ دیا دنیا بھر کے سامنے، مزہ آیا نا عشق کرنے کا؟"

"دادی" کمالاں بولی اور وہ بہت مدت کے بعد اس نوعیت کی گفتگو سننے لگی تھی اس لیے دادی اور ابا دونوں "جی، جی" کہتے ہوئے اس کی طرف گھوم گئے اور وہ بولی

"آخر آپ ان کے چھپ چھپ کر ملنے پر اتنے دکھی کیوں ہیں؟"

بڑھیا اسے راہِ راست پر لانے کے واعظانہ لہجے میں بولی "دیکھ بیٹی رانی۔

مگر سرور نے ماں کی بات کاٹ دی "ٹھہرو اماں! بیٹی کمال خاتون سے میں بات کروں گا۔ یہ بتاؤ کمال خاتون بیٹا کہ تم چھپ چھپ کر ملنے کو بُرا نہیں سمجھتیں؟"

"کِس سے" کمالاں نے پوچھا

"کسی سے" جس سے میں کہوں یا جس سے تم چاہو، ملو گی؟" سرور نے تن کر کہا "خدا تمہارا بھلا کرے!" بڑھیا نے سرور کو داد دی۔ "کیا بات سے بات پیدا کی ہے اور وہ بھی سو بات کی ایک بات، ہاں تو بتاؤ بیٹی جواب دو ملو گی؟"

کمالاں تو جیسے طوفان میں گھر گئی تھی، چکرا سی گئی اور پھر ایک ہی جست میں جیسے اُسے کنارا مل گیا بولی "ہاں! پر جس سے میرا اپنا جی چاہے گا۔"

"ہاں ہاں جس سے تیرا اپنا جی چاہے گا۔" بڑھیا کی باچھیں کھل گئیں۔

"بالکل ـــ اچھا تو کون ہے وہ؟" سرور نے پوچھا۔

جواب کے انتظار میں سرور اور بڑھیا نے سانسیں روک لیں اور پلکیں جھپکنا بھول گئے۔ کمالاں کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آئی جو دیکھی نہیں جا سکتی تھی صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔ بولی " ایسا تو کوئی نہیں۔"

بڑھیا کی باچھیں سمٹ گئیں ۔ سرور ٹہلتا ہوا آنگن کے پرلے گوشے تک چلا گیا اور جیسے اپنے آپ سے سرگوشی کی ۔ حرامزادی۔"

اس رات بڑھیا دیر تک روتی رہی پھر ایکا ایکی اس کی سسکیاں رک گئیں اور ٹوٹتی رات تک ماں بیٹے میں کھسر پسر ہوتی رہی۔ اس رات کمالاں کو بھی بڑی پریشان نیند آئی۔ آنکھیں کھلتیں تو اندھیری چھت کو گھورتی رہ جاتی۔ اور پھر ایک دم آنکھیں بند کر کے سر کو تکیہ کی صورت میں استعمال ہونے والے میلے چیتھڑوں میں یوں جما دیتی جیسے کسی بہت میٹھے خواب کے چاک کو رفو کرنے چلی ہے۔

دوسرے روز بڑھیا اور سرور کا طرز عمل بہت بدلا سا تھا۔ بڑھیا نے بہت بے چین ہو ہو کر پیڑھی پر سے اٹھ بیٹھتی اور کھانستی کھنکارتی ادھر ادھر گھومنے لگتی۔ ٹوٹے ہوئے چھاج کی مرمت کرتے ہوئے کمالاں نے ایک بار پوچھا۔

" کیا بات ہے دادی؟"

" اے بیٹا کوئی خاص بات نہیں ۔" بڑھیا نے کہا۔ " جوانی کمبخت یاد آ رہی ہے ایسی ٹوٹ کر آئی تھی کہ جی چاہتا تھا پہاڑوں کو ہے بھینچ کر انہیں سرمہ بنا کے رکھ دوں، انگلیوں کی پوروں تک سے کوئی چیز پھٹ کر باہر نکلنے کو دھڑکتی رہتی تھی۔ تمہیں دیکھ کر وہ گھڑیاں یاد آ گئیں۔ اس لئے اداس ہو رہی ہوں۔"

سرور بھی اس روز دن میں کئی بار گھر کے چکر لگا گیا۔ ایک بار کمالاں نے

اس سے پوچھا - "کیا بات ہے بابا؟"

"ابکاری کا افسر دورے پر آیا ہے بیٹا! وہ ذراسی افیم تھی اسے ادھر ادھر کیا ہے کہیں چھاپہ نہ پڑ جائے - افیم ہاتھوں سے نکل گئی تو تینوں کے تینوں فاقوں سے مر جائیں گے - بار بار آتا ہوں کہ دیکھوں کہیں سچ مچ چھاپہ تو نہیں پڑ گیا - لوگ ہمیں کنجر کہتے ہیں نا بیٹی، پنچ سمجھتے ہیں ہمیں - اس لیے کچھ دور نہیں کہ کوئی افسر کے پاس شکایت کر دے خواہ مخواہ"

کمالاں کو رونا آگیا - کتنا دکھی ہے بے چارہ بابا، ابھی چالیس برس کا بھی نہیں ہوا پر کیا پنجر طا ہوا سا ہے - دھنسے ہوئے کلے، کہیں دور ہٹی ہوئی آنکھیں جیسے کنوئیں میں گر پڑی ہوں - ذراسی آمدنی سے تین جانوں کو سہارے ہے - تنگی گندی باتیں کرتا ہے تو کیا ہوا، نماز بھی پڑھے گا تو بیچے گا تو افیم کی گولیاں ہی - عبادت سے نصیبے بدلتے تو گاؤں کے مولوی صاحب جیسا پرہیز گار اور نیک انسان آج اس نگری کا بادشاہ نہ ہوتا - بے چارہ بابا -، وہ چپکے چپکے روتی اور آنسو پونچھتی رہی اور ماں بیٹے کو آنگن کے گوشوں میں سرگوشیاں کرتے دیکھتی رہی -

اور شام کو کھانا کھاتے اچانک بڑھیا کا ایک نوالہ منہ میں اور دوسرا ہاتھ میں رہ گیا اور وہ پیڑھی سے یوں چکرا کر گری کہ ایک بار تو سرور اور کمالاں دونوں سناٹے میں آگئے پھر سرور نے لپک کر بڑھیا کو اٹھایا اور چلایا - "اماں - اماں"

"بیٹی - بیٹی" بڑھیا کراہی " درد سے پیٹ پھٹا جا رہا ہے - کچھ کرو ورنہ میں گئی اے بیٹا میں گئی قلنج لگتی ہے - سرور بیٹے قلنج - اے کسی سیانے کو بلواؤ - بیٹا کسی سیانے کو بلواؤ"

سرور نے بڑھیا کو اٹھا کر کھاٹ پر ڈال دیا۔ " قرار لیتے ہیں تو جیون بوٹی سے
یوں چٹکی میں آرام آ جائے گا۔ کہیں دیکھی تو ہے میں نے۔ جانے کہاں دیکھی ہے
دیکھی ضرور ہے یہیں ہی گاؤں میں دیکھی تو ہے۔ پر جانے کہاں دیکھی ہے؟
" قبرستان میں؟" بڑھیا نے مارے درد کے تڑپتے ہوئے کہا۔ " نہیں اماں"
" مسجد میں؟" کمالاں نے پوچھا۔
" نہیں بیٹی۔ وہاں تو کنوار ہے میں جیون بوٹی کی بات کر رہا ہوں"
" تو پھر کہاں دیکھی ہے۔؟" بڑھیا نے آنکھیں بند کر کے یہ الفاظ یوں ادا کئے
جیسے اپنے سینے سے اپنے ہاتھوں سے خنجر نکال رہی ہے۔" جلدی سے یاد
کرو۔ ورنہ میں چلی۔ میں چلی میری بیٹی رانی"
سرور گھبراہٹ میں اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔
اچانک بڑھیا بولی۔ " سلطانے کے کھنڈر میں"
اور سرور نے تالی بجادی " جیو اماں! کیا وقت پر یاد دلایا ہے۔ وہیں ہے
جیون بوٹی۔ میں ابھی لایا" اور باہر جانے کے لئے اس نے پگڑی سر پر لپیٹنا
شروع کی۔
بڑھیا کراہی " تم میرے پاس رکو بیٹا۔ جانے تمہارے پیچھے کیا ہو جائے۔ کمالا
خاتون چلی جائے گی"
" میں چلی جاؤں گی بابا" گھبرائی ہوئی کمالاں نے جوتا پہن لیا۔
اور سرور بولا۔ " دیکھ بیٹا! ایک بڑے کوٹھے کا کھنڈر ہے اور وہاں ایک
چھوٹی کوٹھڑی کے کھنڈر کی دکھنی دیوار کی جڑ میں آگ اگ رہے ہیں۔ ان کے

نیچے مولی لیسے بڑے بڑے پتوں والی ایک بوٹی بھی اُگ رہی ہے - ایک پتہ بھی مل جائے تو اماں کے سارے دُکھ دور ہو جائیں گے "

" اچھا بابا ۔ میں بس پلک جھپکتے ہیں آئی "، کمالاں نے باہر لپکتے ہوئے کہا ۔ سلطانے کے کھنڈروں کے پاس اندھیرے میں ایک کُتا زورہا تھا ۔ تیزی سے آتی ہوئی کمالاں کو دیکھ کر اس نے پیٹ سے لگی ہوئی دم کو اٹھا کر بھونکنے کی کوشش کی مگر صرف ٹیاؤں کی آواز نکال پایا اور بھاگ کھڑا ہوا ۔ اب تک کمالاں بڑے بڑے جوش سے چلی آرہی تھی ۔ کُتے کے رونے اور بھاگنے سے وہ ہولا گئی اور ٹھٹھک کر رہ گئی پھر چھوٹی کوٹھڑی کے کھنڈر میں قدم رکھا تو ٹوٹی پھوٹی دہلیز کے کسی سوراخ پر بیٹھے ہوئے جھینگر نے دم سادھ لیا اور اس سناٹے میں دور کے جھینگروں کی آوازیں بڑی ڈراؤنی معلوم ہونے لگی ۔ خود کمالاں نے بھی جیسے اس لمحے کی ہیبت سے دم لیا اور گھٹتے ہوئے تہ بند کو دونوں ہاتھوں کی چٹکیوں سے اٹھائے آگے بڑھی ۔ آک کے سوکھے پتوں کو چھوا تو وہ اپنی بھونڈی آواز میں بج اُٹھے ۔ خاموشی میں ان کی آواز معمول سے کہیں اونچی اور پھٹی پھٹی معلوم ہوئی پھر وہ آک کے پاس بیٹھ کر اس کی جڑوں میں جیون بوٹی ڈھونڈنے ہی لگی تھی کہ یکایک آک کے بہت سے پتوں کے کھڑکھڑانے کی آواز آئی :

" آگئیں میری جان " ـــــ چیخ جیسے کمالاں کے حلق ہڈی کی طرح اٹک کر رہ گئی ان گلابی جاڑوں میں بھی اس کا جسم تپ گیا اور جگہ جگہ سے پسینہ پھوٹ پڑا " میں جانتا تھا کہ تم کبھی نہ کبھی ضرور آؤگی اور آخر آج ـــــ "، کمالاں اتنی قوت سے جست لگا کر کوٹھڑی سے باہر آئی کہ بولنے والا اس قطعی غیر انسانی قوت سے گھبرا سا گیا اور پھر کمالاں بھاگ اٹھی ۔ اس وقت اس کے تمام حواس بہت تیز ہو رہے تھے ۔ وہ جانتی

تھی کہ اس کا تعاقب ہو رہا ہے۔ اور قدموں کی چاپ لمحہ بہ لمحہ اس کے قریب آ رہی ہے لیکن جب وہ گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہوئی تو کچھ سوچ کر رُک گئی اور دیوار کے ساتھ لگ لگ کر چلنے لگی، تعاقب کرنے والا بھی آبادی کے قریب آجانے کے باعث کہیں رُک گیا تھا۔ ہانپتی کانپتی کمالاں دیوار کو ٹٹول ٹٹول کر چلتی اپنے گھر تک پہنچ گئی۔ اور وہاں اچانک اسے خیال آیا کہ اس کی دادی مر چکی ہے۔ گھر خاموش تھا۔ دادی کراہ نہیں رہی تھی۔ اور وہ کیسے کراہے؟ کمالاں نے سوچا۔ بابا اس کی پائنتی سے لگا رو رہا ہو گا اور جیون بُوٹی کا انتظار کر رہا ہو گا اور ـــــ کمالاں مارے دکھ اور شرمندگی کے آنگن میں دیر تک رکی رہی پھر پنجوں کے بل دروازے تک آئی اور کان لگا کر سننے لگی۔ دادی زندہ تھی۔

دادی کہہ رہی تھی "نصیبہ کھل بھی سکتا ہے اور چوپٹ بھی ہو سکتا ہے۔ قادرے کے بس میں آگئی تو جانو اللہ نے روزی کا سامان پیدا کر دیا اور جو وہاں سے بھی پھر پھرا کر بھاگتی ہے تو بیٹا! مجھے زہر کی چٹکی دے دینا۔ انتظار کرتے کرتے آنکھیں سفید ہو چلی ہے۔ اب بھی چاند نہ ابھرا تو سمجھو یہ رات ختم ہونے کی نہیں۔"

کمالاں کو جھرجھری آگئی جیسے ایک دم بہت سی سرسریاں اس کی رگوں میں دوڑنے لگی ہوں۔

پھر سرور بولا "قادرے سے وعدہ تو دس کا ہے پر کہتا تھا کہ اگر کمالو نے خوش کیا تو پندرہ دے دوں گا۔ روز کے دس پندرہ کمانے لگے تو حرامزادی خود بھی مرنے بس رہے گی۔ پر مجھے اس پر اعتبار نہیں اماں! بچپن میں مولوی کے پاس رہ کر کمبخت نے رگوں میں برف بھر لی ہے کہ کیا۔ گرمی تو اسے چھو کر بھی
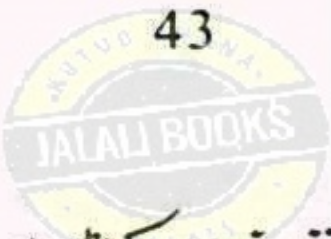
نہیں گئی۔"

"پر بیٹا"۔ دادی نے کہا "تم نے اسے ٹھکانے بھیجنے کی ترکیب بہت اچھی سوچی ہے۔"

کوارٹوں کو جیسے کسی نے پٹخ دیا۔ بڑھیا اور سرور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے اور ذرا سی دیر میں انہوں نے دیے کی مدہم روشنی میں کمالاں کو پہچان لیا۔ بڑھیا فوراً کراہنے لگی اور بل کھانے لگی لیکن سرور تو جیسے بت بن چکا تھا۔ بڑھیا نے بڑی مشکل سے ہمت باندھ کر کچھ عجیب سی غیر قدرتی آواز میں پوچھا۔ "بوٹی لائیں بیٹا"..... کمالاں یوں اندر آئی۔ جیسے بڑھیا کو دبوچنے کے لئے بڑھی ہے۔ سرور دیر تک لرز گیا۔ مگر وہ دادی اور ابا کو غصے سے دیکھتی اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی اور بستر پر گر کر بلبلا بلبلا کر رونے لگی۔ بڑھیا اور سرور بیٹھے ایک دوسرے کو بے وقوفوں کی طرح دیکھتے رہے۔ اور جب اُدھر سے کمالاں کے رونے کی آواز رُکی تو ادھر بڑھیا نے رونا شروع کر دیا اور جب بڑھیا خاموش ہوئی تو سرور وہاں سے اٹھ کر اپنی کھاٹ پر آیا اور سر سے پاؤں تک چادر پھیلا کر لیٹ گیا۔

اس رات بڑھیا دیر تک جاگتی رہی۔ کوٹھے میں ٹہلتے ٹہلتے اکتا جاتی تو باہر آنگن میں نکل جاتی۔ وہاں پالا کاٹتا تو اندر بھاگ آتی۔ سونے کی کوشش کرتی۔ بھڑک کر اٹھ بیٹھی اور پھر ٹہلنے لگتی۔ اور جب صبح سرور اُٹھا تو اس نے دیکھا کہ بڑھیا کراہ رہی ہے۔ وہ اُٹھ کر اس کے پاس آیا اور جھک کر بولا۔

"اماں سچ مچ کہ جھوٹ موٹ۔؟"

بڑھیا نے بڑے کرب سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے

بولی "تم یوں نہ پوچھو گے تو اور کون پوچھے گا بیٹا"؟

سرور اس کے پاس بیٹھ گیا "نہیں اماں! معاف کرو، تو کیا سچ مچ بیمار ہو؟"

بڑھیا نے کہا "پسلی میں درد اٹھا ہے بیٹا! چھریاں سی چل رہی ہیں"

سرور حواس باختہ سا وہاں سے اٹھا اور بولا "میں ڈاکٹر سے کوئی دوا لے کر ابھی آیا۔

سرور کے جانے کے بعد بڑھیا دیر تک کراہتی اور روتی رہی۔ کافی دیر کے بعد وہ پکاری "بیٹا کمال خاتون"

کمالاں دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ بال اجڑے اجڑے تھے اور ہونٹوں پر سفیدی جھلک رہی تھی۔

"بیٹا" بڑھیا نے فریاد کی۔

کمالاں وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

"ایک پیالی چائے مل سکتی ہے؟" اس نے گداگروں کی سی لجاجت سے کہا۔

کمالاں پلٹ کر باہر چلی گئی۔

سرور کوئی دوائی لے کر آیا تو بڑھیا چائے پی رہی تھی اور کمالاں چپ چاپ اس کے پاس کھڑی تھی۔ سرور کی دھنسی ہوئی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "اپنی دادی کو چائے پلا رہی ہو بیٹی" وہ بولا اور کمالاں کو خاموش پا کر بڑھیا کے پاس بیٹھ گیا۔ یہ سفوف دیا ہے ڈاکٹر نے۔ کہتا تھا یہ سفوف بھی اچھا ہے پر ایک انگریزی ٹیکا نکلا ہے بڑے زور کا۔ پسلی کا درد آن کی آن میں غائب ہو جاتا ہے۔ دوا تم منگالو ٹیکا میں لگا دوں گا۔ تیس چالیس لگتے ہیں"

لیکن اس تیس چالیس کی الجھن میں ٹیکا لانے کی بجائے بڑھیا کو ہوش میں لانے کی نوبت پہنچی ۔ باقی افیم اور کمالاں کے چاندی کے دو بندے بیچ کر روپے ڈاکٹر کی نذر کئے ۔ مگر شام کو جب یہ ڈاکٹر جو کمپاونڈری سے استعفیٰ دے کر ڈاکٹر بن گیا تھا مریضہ کو دیکھنے آیا تو بڑھیا کی نظریں چھت پر کسی نقطے پر جم چکی تھیں اور وہ پنڈلیوں میں اینٹھن کے باعث پاؤں کو پٹخ پٹخ دیتی تھی ۔ ڈاکٹر خفا ہونے لگا کہ تم لوگ اس وقت سیانے کو بناتے ہو جب زندگی کی آخری رمق تک بجھنے والی ہو۔ اب دوا سے کچھ نہیں ہوگا ۔ خدا کا نام یاد ہو تو دعا کرو اور بس ۔ اس وقت بات میرے بس سے نکل چکی ہے ۔ قرآن مجید کے ختم کے لئے کسی کو بلوا سکتے ہو تو بلواؤ ورنہ مرنے والی کو تو مرنا ہی ہے ۔"

سرور جاتے ہوئے ڈاکٹر کو دیر تک دیکھتا رہا ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی اماں کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرتا ہے ۔ پھر اچانک اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور وہ ماں کی پٹی پر سر رکھ کر رونے لگا ۔ اس کی پگڑی اور لمبے بھوسلے بال ادھر اُدھر لٹک گئے ۔ کمالاں بھی رونے لگی اور باپ بیٹی نے جب روتے روتے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو جیسے ایک دوسرے کی آنکھوں میں کچھ پڑھ کر دونوں نے ایک ساتھ بڑھیا کی طرف دیکھا ۔ سرور اچانک سنجیدہ ہو گیا اور اس نے پگڑی اٹھا کر آنسو پونچھے اور اٹھ کر بڑھیا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا ۔ پگڑی کا ایک پلو پھاڑ کر بڑھیا کی ٹھوڑی کے نیچے سے گزارا اور سر پر کس کر گرہ باندھ دی پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا ۔ " تم یہیں اپنی دادی کے پاس بیٹھو بیٹی ! کچھ یاد ہو تو پڑھتی رہو ۔ میں کسی موچی دھوبی سے قبر کے لئے کہہ آؤں ۔ جلدی سے جنازہ ٹھکانے لگ جائے

تو کتنے ہیں قبر حساب نہیں لینی "—— اس نے ایک بار پھر آنسو پونچھے، پگڑی بھتیے پن سے لپیٹی اور باہر جاتے دروازہ یوں کھولا اور بھیڑا جیسے مردے کے جاگ اٹھنے کا اندیشہ ہے۔

کمالاں نے زندگی میں پہلی بار کسی کو مرتے دیکھا تھا۔ ابا کے جاتے کے بعد اس نے مری ہوئی دادی کی سمت ڈرتے ڈرتے ایک نظر ڈالی۔ نیم وا آنکھوں میں سفیدی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میلی زرد رنگت کو چراغ کی میلی زرد روشنی نے اور نمایاں کر دیا تھا۔ پھر اسے کچھ ایسا لگا جیسے دادی کے لبوں پر حرکت ہوئی اور ہونٹ ذرا سا اوپر اٹھے ہیں۔ گھبرا کر وہ زمین کو دیکھنے لگی اور پھر اٹھ کر دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے دادی کا چہرہ ڈھانپ دیا۔ لیکن اس کا ہاتھ دادی کے ماتھے کو چھو گیا اور اس کے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ کتنا ٹھنڈا تھا دادی کا ماتھا۔ وہ زمین پر بیٹھ کر سورۃ اخلاص پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے اسے محسوس ہوا کہ دادی کے ہاتھ چادر کے نیچے ہلے ہیں" دادی" وہ چیخ کی حد تک چلائی۔ "بابا" دروازہ کھول کر پوری شدت سے پکاری۔ باہر گلیوں میں کتے بھونک رہے تھے اور کہیں دور سے ڈھول اور شہنائی بجنے کی آواز آرہی تھی۔ آنگن میں دروازے کے قریب ہی دادی کی پیڑھی رکھی تھی۔ ایکایکی اس پر ایک سایہ سا آکر بیٹھ گیا یہ بوڑھی دادی تھی۔ کمالاں نے اس زور سے کواڑ بند کئے کہ جھریوں میں سے سوکھے گارے کی قلمیں سی نکل کر گر پڑی۔ وہ پسینے میں یوں شرابور ہو رہی تھی جیسے پگھلی جا رہی ہے لپک کر اس نے دادی کے چہرے پر سے چادر نوچ لی۔ نیم وا آنکھوں کی سفیدی بڑھ رہی تھی اور پھر اسے یوں لگا جیسے دادی نے آنکھیں جھپکی ہیں۔" دادی" وہ

ایک بار پھر اسی شدت سے چیخی اور دھڑام سے زمین پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو سرور اس پر جھکا ہوا تھا۔" اٹھو میری بیٹی! جاگو۔ آنکھیں کھولو۔ اری پگلی تجھے کیا ہوا تھا؟"

" میں ڈر گئی تھی بابا"، اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ سامنے دادی کے مردہ جسم کے پاس مولوی صاحب بیٹھے سورۂ یٰسین پڑھ رہے تھے۔ کمالاں نے جھپٹ کر دوپٹہ اوڑھا اور مؤدبانہ بیٹھ گئی۔ مولوی صاحب نے پڑھتے پڑھتے اس کی طرف دیکھا۔ مسکرائے اور اشارے سے پاس بلایا۔ وہ اٹھی اور دادی کی کھاٹ کی پرلی طرف مولوی صاحب کے مقابل بیٹھ گئی۔ انہوں نے اپنے ہونٹوں کو انگلیوں کی پوروں سے چھو کر اسے کچھ پڑھنے کے لئے کہا۔ وہ ایک سعادت مند بچی کی طرح سورۃ اخلاص کا ورد کرنے لگی۔ پھر مولوی صاحب نے سرور کو بے فکر رہنے کا اشارہ کیا وہ اٹھا اور دروازے کو اسی احتیاط سے کھول کر باہر چلا گیا۔

سرور ساری رات قبر اور کفن وغیرہ کے سلسلے میں بھٹکتا پھرا۔ دوسرے دن بڑھیا کو دفن کر کے آیا تو آنگن میں موچیوں، جولاہوں کی چند عورتیں کمالاں کے پاس بیٹھی رو رہی تھیں، وہ چپکے سے کوٹھے پر چلا گیا۔ خوب خوب رویا اور پھر سو گیا۔ عورتیں چلی گئیں تو کمالاں اوپر آئی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی " بابا" ـــــ اور پھر جواب نہ پا کر اس پر ٹوٹ پڑی لیکن کھاٹ کی پٹی کے پاس جا کر رک گئی اور چہرے پر کچھ ایسے آثار نمودار ہوئے جیسے اب بس چیخنے ہی والی ہے۔ لرزتے ہوئے ہاتھ سے اس نے سرور کے ماتھے کو چھوا، اور مسکرانے لگی، وہ مارے خوشی کے پکار اٹھی۔ سرور نے آنکھیں کھول کر ادھر اُدھر دیکھا۔

"میں تو ڈر گئی تھی بابا!" کمالاں اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔
"تو کیا مجھے بھی مردہ سمجھ لیا تھا تم نے؟" سرور بولا
کمالاں چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی اور بہت دیر کے بعد بڑے پیار سے بولی۔ "بابا"
سرور بے اختیار رونے لگا اور جب بہت سے آنسو اس کی آنکھوں کے گڑھوں میں بھر گئے تو وہ ایک مسلسل دھار کی طرح بہ نکلے اور پھر وہ بڑی ملائم مگر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔
"بیٹی! دیکھو مجھے معاف کر دو۔ میں بڑا کمینہ ہوں۔ بڑا کمینہ ہوں میں۔"
اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچ لئے اور سر پیٹ لیا۔ "میں بڑا رذیل، خبیث، کتا، کمینہ ہوں کمالو، میں نے اپنی بیٹی کو۔ اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو کنجری بنانا چاہا۔ تم مجھے مار دو میری بیٹی، میرا گلا گھونٹ دو۔" پھر اس نے کمالاں کے ہاتھوں کو جکڑا اور انہیں اپنی گردن پر رکھ دیا۔ "میرا گلا گھونٹ دو کمالو بیٹی، مجھ پر احسان کرو۔ میں کتنا کمینہ باپ ہوں کتنا کمینہ باپ ہوں۔ سچ مچ کا کنجر۔" وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔
کمالاں نے اپنے ہاتھ کھینچ لئے مگر اسے اپنے بابا کو تسلی دینے کے لئے کوئی لفظ نہ سوجھا۔ بابا کے حق میں اسے کوئی بات مل ہی نہ رہی تھی کہ اُسے بہلا کر تھپکتی تو کیا وہ یہ کہتی کہ نہیں بابا، تم نے بہت اچھا کیا۔ تم نے کون سی بری بات کی۔ بس وہ چُپ چاپ بیٹھی روتی رہی اور پھر اس کا سر دبانے کے لئے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ بڑی نرمی اور پیار سے وہ اس کے ماتھے کی ہڈی دبانے

رہی - پھر جیسے کچھ سوچنے لگی اور ماتھے سے ہاتھ اُٹھا کر سرور کے گالوں پر رکھ دیئے - تیزی سے جیسے چونک کر اس نے چادر کے اندر سے اس کا ہاتھ ڈھونڈ نکالا اور اُس کی نبض دیکھنے لگی ۔ پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے گھورنے لگی اور کچھ دیر کے بعد جیسے بہت دُور سے بولی :

" تمہیں تو بخار ہے بابا "

" ہاں بیٹی ! " وہ بولا " ادھر دونوں پسلیوں میں چبھن سی ہے "

کمالاں سناٹے میں آگئی ۔ کھاٹ پر لیٹا ہوا بابا اچانک دادی میں بدل گیا ۔ اس کی آنکھیں سفید ہوگئیں ۔ چہرے پر میلی میلی زردی کھنڈ گئی اور اسے بابا کی ٹھوڑی تلے سے ایک پٹی بھی گزرتی دکھائی دے گئی ۔ وہ ایک چیخ مار کر سرور سے لپٹ گئی ۔ اس کے سر اور ماتھے پر اپنا چہرہ ملنے لگی اور رو رو کر پکارتی گئی ۔ " نہیں بابا ، تم نہیں مرو گے بابا ، میں تمہیں نہیں مرنے دوں گی ۔ نہیں بابا ۔ نہیں ۔ نہیں " وہ بچوں کی طرح مچل گئی ۔ سرور اس کے سر پر شفقت بھرے ہاتھ پھیرتا رہا اور ساتھ ساتھ روتے روتے کہتا رہا " نہیں بیٹی نہیں ۔ میں نہیں مروں گا ۔ تم مجھے بخش دو تو میں جیوں گا ۔ پھر جینے پر حق ہو گا میرا "

کمالاں کے سُوجے سُوجے ہونٹوں اور سُرخ سُرخ گالوں پر آنسوؤں کی وجہ سے بال چمٹ گئے تھے ۔ وہ انہی بالوں میں سے اپنے بابا کو دیکھنے لگی اور دیکھتی رہی ۔

" بخش دو بیٹا " سرور نے چادر میں سے ہاتھ نکالے اور انہیں جوڑ لیا ۔

اور آنسوؤں میں نہائی ہوئی کمالاں مسکرا دی ۔

سر کھاٹ پر اُٹھ بیٹھا " اب میں نہیں مر سکتا بیٹی ، تم ڈاکٹر کے پاس جا کر ذرا سا وہ سفوف تو لیتی آؤ ۔ کہنا پسلی کا درد ہے دونوں طرف ۔ ٹیکے کا کہے تو کہنا ہم غریب ہیں ۔ جاؤ بیٹا ۔ پر جانے سے پہلے مجھے ایک بار پھر اسی طرح دیکھ لو مسکرا کر "

کمالاں نے باہر جا کر منہ دھویا اور ڈاکٹر کے ہاں چلی گئی ۔ ڈاکٹر نے سفوف تو دے دیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ آج کل نمونیہ کے مریض تابڑ توڑ مر رہے ہیں پر جو مریض ٹیکہ لگواتا ہے وہ بچ جاتا ہے ۔ باپ کی زندگی چاہیے تو کہیں سے ایک ٹیکہ پیدا کرو ۔ سمجھیں ؟"

" کتنے میں آئے گا ٹیکہ ؟" کمالاں نے پوچھا ۔

" بس یہی کوئی چالیس پچاس میں " ڈاکٹر بولا " پنسلین نام ہے ، قصبے میں مل جائے گا "

واپس گھر آ کر اس نے بابا کو پانی کے ساتھ سفوف تو کھلا دیا مگر ٹیکے کا خیال اس کے ذہن میں سوئیاں سی چبھوتا رہا ۔ شام تک سرور کو اس زور کا بخار چڑھا کہ دور سے ہی آنچ آنے لگی ۔ کمالاں پھر ڈاکٹر کے پاس دوڑی گئی ۔ سفوف تو لے آئی مگر ٹیکے کی رٹ جاری تھی ۔

رات بھر وہ بابا کے پاس بیٹھی رہی ۔ سوئی بھی تو کھاٹ کی پٹی کے سہارے سرور منتیں کرتا رہا کہ جا کر سوئے مگر وہ رو دیتی اور بچوں کی طرح نفی میں سر ہلا ہلا کر انکار کر دیتی ۔

صبح ہوتے تک سرور بے حال ہو چکا تھا ۔ کمالاں ڈاکٹر سے سفوف کی تیسری خوراک لینے نکلی تو لوگ اُسے دیکھ کر ٹھٹک گئے ۔ سوجی سوجی سُرخ آنکھیں

اُجڑے بال، خشک ہونٹ جیسے کہیں سے پٹ کر آ رہی ہے۔

ڈاکٹر اس کے ساتھ چلا آیا۔ سرور کی نبضیں دیکھیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمالاں کو دیکھنے لگا "تو کیا اپنے باپ کو مارنے کے ارادے ہیں تمہارے؟" وہ بڑے غصے سے بولا "ٹیکہ لاؤ ٹیکہ، نہیں؟ اب کے ٹیکہ لائے بغیر میرے پاس نہ آنا" اور وہ تھیلا اٹھا کر چلا گیا۔

سرور ہنسنے لگا "ٹیکہ!" وہ بولا اور کراہتے ہوئے سمٹ گیا۔

اور کمالاں چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیے کھاٹ کے پائے کا سہارا لیے باہر دھوپ میں کھیلتی ہوئی چڑیوں کو دیکھنے لگی۔

دن ڈھلے وہ اٹھی اور ایک گلی کا چکر لگا کر یوں واپس آگئی۔ جیسے محض ٹہلنے نکلی تھی۔ وہ پھر اسی طرح کھاٹ سے لگ کر بیٹھ گئی۔

"ٹیکہ!" سرور پھر سے ہنسا۔ "کہتا ہے ٹیکہ لاؤ۔ ڈاکٹر بنا پھرتا ہے، ٹیکے بغیر ٹھیک کر دے تو مانوں۔ اور بیٹی! دیکھو! میری طرف دیکھو۔ میں مروں وروں گا نہیں۔"

"میں تمہیں نہیں مرنے دوں گی بابا۔" کمالاں نے جیسے سرور سے کوئی راز کی بات کی۔

شام سے پہلے وہ سرور کو چائے پلا رہی تھی کہ چونک باہر نکل گئی۔ گاؤں بھر کی گلیوں میں وحشت زدہ گھومتی رہی اور جب گاؤں کی مسجد میں شام کی نماز پڑھی گئی تو اُسے گلی میں مسجد کی باہر نکلی ہوئی محراب کے پیچھے ابراہیم مل گیا۔ اور وہ یوں بولی۔ جیسے غیر ارادی طور پر یہ الفاظ اس کے منہ سے برس پڑے

"تم تو ہم سے دُور رہتے ہو ابراہیم، ملتے ہی نہیں۔"

ابراہیم جیسے ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ بڑی دیر کے بعد ادھر اُدھر دیکھ کر سرگوشی میں بولا "تمہارے حکم کا انتظار تھا۔"

"تو پھر آج ملو۔" وہ اسی سپاٹ لہجے میں بولی۔

"کہاں؟"

"میرے گھر ہی میں۔" پھر ذرا سا رک کر بولی۔ "دادی تو مر گئی ہے نا۔"

"کب آؤں؟"

"بس لوگ سوتے آ جاؤ، میں گھڑیاں گنوں گی تمہارے لیے، بے دھڑک آنا، بابا بیمار ہے اور بے ہوش پڑا ہے۔"

ابراہیم کے تو جیسے پر لگ گئے اور اُدھر کمالاں بھی اُڑتی ہوئی گھر پہنچی۔ چائے کی پیالی سرور کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ چکی تھی اور وہ "پانی پانی" پکار رہا تھا۔

پانی کے چند گھونٹ پی کر وہ بڑے دکھ سے بولا۔ "اتنی دیر تک مجھے اکیلا نہ چھوڑ دیا کرو بیٹی۔ ڈر لگتا ہے۔"

کمالاں کچھ نہ بولی۔ اس کا سر دبانے لگی اور جب اس پر غنودگی سی چھا گئی تو پنجوں کے بل چلتی ہوئی دوسری کوٹھڑی میں آئی اور وہاں چیتھڑوں کو میلے گدے کے نیچے چھپا کر "تکیے" کی شکل پیدا کر لی۔ گدے پر اپنا دوپٹہ بچھا دیا اور آنگن پر کھلتا ہوا دروازہ کھول کر وہاں چہرے کو دونوں ہاتھوں میں رکھ کر بیٹھ گئی اور لوگ سونے تک بیٹھی رہی۔

ابراہیم دبے پاؤں آیا تو جب بھی وہ اسی طرح بیٹھی رہی - قریب آکر اس نے آہستہ سے کہا " کمالی "۔

" ایں " وہ چونکی اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی " ارے تم آگئے "۔ وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر اندر لے آئی -

اور پھر سرور پانی پی کر کراہنے لگا پھر چلانے لگا۔ پھر رونے تک لگا۔ اور ادھر بہت دیر کے بعد جب ابراہیم اٹھ کر جانے لگا تو کمالاں لپک کر آئی اور دروازے سے چمٹ کر کھڑی ہو گئی -

" پانی " سرور دوسرے کوٹھے میں رویا

ابراہیم کچھ دیر کھڑا کمالاں کی وحشت کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا - پھر بولا

" اب چلیں پیاری " لیکن کمالاں اپنی جگہ سے نہ ہلی -

" پانی " سرور ادھر سے چلایا

ابراہیم نے ہاتھ بڑھا کر کنڈی کھولنے کی کوشش کی " کل پھر ملیں گے میری جان "۔

اور آخر کمالاں بولی " کل تو خیر ملیں گے مگر آج کی اجرت کہاں ہے ؟ "

" اجرت ؟ " ابراہیم غصے میں بولا " اجرت مانگتی ہے ؛ عاشقی کی اجرت مانگتی ہے - شرم نہیں آتی ؟ آخر کنجری ہے نا کنجری "۔

اس نے کمالاں کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا :-

گشتی

حمایت مدنب

برده ہٹا، وہ چھم سے اندر گئی۔ نیک سائیں باہر تکیے میں بیٹھا دیکھتا ہی رہ گیا ایکا ایکی شعلہ لپکا اور آنکھوں میں دھول جھونک کر سامنے سے گزر گیا۔ بیتی پیرنی شعلہ ہی تو تھی لیکن اس وقت اس کے دہکتے ہوئے چہرے پر گرد کی مہین سی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ نیم پریشان سنہری بالوں میں راستے کی چلتی ہوئی دھول بکھر رہی تھی اور اب حسن میں ابہام کی کیفیت آگئی۔ حسن ذرا پردے میں ہوا تو اس کا جادو اور بڑھا۔

جس گھر کو ٹھکرا کر گئی اس نے پھر خیر مقدم کیا۔ میز پر ریڈیو کے قریب اس کی تصویر پر ہار پڑا تھا۔ غالیچے کے رنگ اسی طرح چمک رہے تھے اور اس میں نام کو سلوٹ نہ تھا۔ الماری میں کراکری قرینے سے دھری تھی۔ کمرے میں کہیں جالا تھا نہ مٹی تھی کاٹھ کے چوکھٹے میں جڑا ہوا آئینہ بالکل صاف تھا اور جب برقع اتار کر مقابل کھڑی ہوئی تو وہ اس کے بھرپور بدن کے جادو سے جگمگا اٹھا۔ بڑی بڑی پھیلواں آنکھوں سے افق تا افق اجالے پھیل رہے تھے۔ پھر جب اس نے تھکن دور کرنے کو ننگی باہیں سر سے اوپر اٹھائیں اور انگلیوں میں انگلیاں الجھائیں تو آئینے کی حدیں پھلانگ گئی۔ اسے اپنے بدن کی دہکتی ہوئی شان دیکھنے کے لئے کچھ پیچھے ہٹنا پڑا۔ انگ انگ میں چمکتا ہوا لہو آئینے کی رگوں

میں نکھرا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ جان گئی کہ نیک سائیں اس کے لہو کی مار نہ سہہ سکے گا۔ لیکن فارم میں آتے آتے تھوڑا بہت وقت ضرور لگے گا۔ وہ چپکے سے بستر پر دراز ہو گئی۔ اس نے آنکھیں بیچ لیں، کان کھلے رکھے۔

نیک سائیں مسکرایا۔ وہ تکیئے کا بادشاہ تھا۔ اس کی رعیت میں چند قمار باز، چند نوسر باز چند گرہ کٹ، چند کوچیان، اگاڑیان، چند گوییے، ایک سنار، ایک لوہار، ایک بھلبرا، ایک بڑھئی، اور چند شاگرد پیشہ لڑکے شامل تھے۔ ان میں کچھ سلوک کی منزلیں طے کر کے ملنگ بن گئے، کچھ ملنگ کا مقام پانے کی آرزو لئے رہے۔ اور کچھ کے نزدیک تکیئے کو کلب سے زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی۔

بادشاہ مسکرایا۔ اپنی نیم جاں رعایا کو تکیئے کے کشادہ آنگن میں چاروں طرف دیکھ کر شوکت شاہانہ دوبالا ہوئی اور جیت کے احساس نے اسے زمین سے بالشت بھر اونچا کر دیا۔ حالانکہ نیتی پیرنی کی آمد سے پہلے وہ بھنگ کی ترنگ میں زمین سے بالشت بھر نیچے چلا گیا تھا۔ ویسے وہ راج سنگھاسن پر براجمان تھا۔ بھنگ کی مستی نے ہلکورا لیا تو وہ اور موتی شاہ دونوں ہنسنے لگے اور جوں جوں ہنسے مستی سوا ہوئی اور کچھ دیر کے بعد دونوں بے طور ہو گئے۔ وہ بھول ہی گیا کہ نیتی پیرنی آنگن چیر کر اس کے سامنے سے کمرے میں گئی ہے۔ شکست کی ندامت نے اسے دبوچ لیا ہے۔ یہی ندامت چپ کی مہر بن کر اس کی زبان پر لگ گئی۔ ہوا چلی تو اس کی شانِ سکندری میں کچھ اور نکھار پن آیا۔ بکھرے ہوئے حواس جمع کئے۔ اس نے کھانس کھنکار کر گلے کا ساز ٹھیک کیا اور بدن کو جھنجھوڑا تاکہ چست ہو جائے اور فاتحانہ انداز میں مکالمہ ادا کرے۔ اس نے اپنا راج سنگھاسن محسوس کر لیا۔ اور نیچے چبوترے پر اپنے وزیر باتدبیر۔ موتی شاہ کے ہمراہ

بیٹھا تھا ۔ نیچے رعایا اوندھے منہ پڑی تھی ۔ جو ہوش میں تھے ان کی آنکھوں میں خوابوں کے حسین جزیرے بیکل تھے، جو بے ہوش تھے ۔ تکیئے کا کتا بولی؟ اُن کے نشیلے سانس کی بو سونگھتا پھرتا تھا ۔ سہ دری میں اس کا سکھ یا سدھایا ہوا فادر قینچی مار جوا کھیل رہا تھا ۔ دو تین لڑکے جو غنڈوں کا کیریر اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے تربیت کی پہلی منزل طے کر رہے یعنی ڈنڈ پیل رہے تھے ۔ بادشاہ تکیئے کی ایک سمت سے گردن گھماتا گھماتا دوسری سمت لے گیا ۔ یوں اعتماد اور توانائی بٹورتا گیا ۔ اس نے قہقہہ لگایا اور پھر اپنے وزیر باتدبیر سے کہا "جتھوں دی کھوتی اوتھے آن کھلوتی"۔

کانوں کے پردوں پر ضرب پڑی اور نیتی بیری تلملائی ۔ گالوں پر خشمناک سرخی پھیل گئی لیکن سُنی اَن سُنی کر گئی ۔ اندر سے جواب نہ آیا تو بادشاہ کا حوصلہ بڑھا ۔ اس نے پھر وزیر باتدبیر سے کہا، "موتی شاہ! دیکھا وہ پھر آگئی ۔ اسے سُکھ کی روٹی اچھی نہیں لگتی ۔ یہاں آبرو سے رہنا پسند نہیں ۔ کوئی پوچھے، میری بادشاہت میں کس شے کی کمی ہے ۔ میری قدر نہیں اسے ۔ بارڈر قدموں میں ہے ۔ وہاں جا کے پوچھے کس پائے کا سمگلر ہوں"۔

جب تک سائیں کی بلیغ گوئی کا سلسلہ طوالانی ہوتا نظر آیا تو نیتی کے چہرے کی خشمناک سرخی شعلہ بنی، شعلہ اچک کر زبان پر آیا ۔ جلال میں آئی ۔ کچھ دیر کے لئے وہ عورت بن گئی تھی اور اب جو صورتِ حال پیدا ہوئی تھی ۔ اس سے عورت نمٹ نہ سکتی تھی ۔ وہ آپے میں آئی ۔ عورت جھمک کر رنڈی بن گئی اور چہک کر بولی "بکواس بند کرے گا کہ یونہی شروع رہے گا ۔ شریفوں کی طرح گھر آگئی ہوں تو کمینے کا دماغ ہی چل گیا ۔ جانے کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو"۔

عورت کو دیکھ کر وہ سچ مچ بادشاہ اور فاتح بن گیا اور اس کا دماغ چل گیا تھا۔ لیکن جب رنڈی سامنے آئی تو وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ بلبلا تھا، ہوا نکل گئی اور ختم ہو گیا۔ یہ جمیلہ نہیں تھی جسے وہ ڈانٹ لیتا۔ مار پیٹ لیتا اور وہ رو دھو کر ہی احتجاج کی رسم پوری کر لیتی۔ جمیلہ عورت تھی اور عورت کے پاس آنسو سے آگے کوئی ہتھیار نہیں ہوتا۔۔ نیک سائیں ہتھ چھوٹ تھا لیکن جمیلہ کی بجائے جب چمکتی دمکتی ہوئی رنڈی سے مقابلہ ہوا تو بادشاہ کے سارے کس بل نکل گئے۔ نیتی چق اٹھا کر بکھرے ہوئے بالوں کے سنہری جلال اور پر شکوہ چال سے باہر آئی تو وزیر با تدبیر دم دبا کر ایک طرف چلا گیا۔ نیک سائیں نے سنبھلنے کے لئے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا۔ اور پھر جب رنڈی نے دور ہی سے چلا کر کہا "اٹھ وہاں سے، اندر چل" تو بادشاہ سلامت کو دھوتی کے ڈھیلے پلّو باندھنا مشکل ہوئے۔ بادشاہ تو بلکہ ڈھیر ہی ہو گیا ـــــــ بالکل اسی طرح جس طرح خوابوں کے جزیروں میں ناچنے والی رعایا تکیئے کے کشادہ آنگن میں ڈھیر تھی۔

"ابھی لے سوہنیے تو تو یونہی خفا ہوتی ہے۔"

بادشاہ کمرے میں چلا گیا۔ اب وہ ایک پری کے حضور میں تھا جسے شیشے میں اتارنے کے لئے قدِ آدم شیشہ سامنے ہی دھرا تھا اور لنڈی کوتل سے کمرہ سج سنور رہا تھا۔

"یہ باہر بیٹھ کر بکنے کی تجھے کیا عادت ہے؟ تیری زر خرید لونڈی تو نہیں، تیری بیاہتا تو نہیں، نخرے جا کے دکھا جمیلہ کو! مر رہی ہے تیری جان کو۔ میں تیری بیاہتا نہیں" پری نے بالوں میں کنگھی پھیرتے ہوئے کہا۔

"ارے اپنے نصیب میں بیاہتا کہاں؟ تکیئے کی زندگی ہے اور سو سو ولیداریاں ہیں۔ کیسے کوئی بیاہ کرے ہم سے؟"

"بیاہ تو تیری ماں نے بھی نہیں کیا، تو کیا کرے گا!" جمیلہ نے بیاہ کا مزا چکھ لیا:
"چل چھوڑ غصے کی باتیں بھاگ بھریئے!"

سامنے کی الماری کے پٹ چوپٹ تھے اور وائٹ ہارس کی بوتل کے پیندے میں شراب چمک رہی تھی۔ نیتی تیبٹ پی گئی۔ مستی نیتی پیرنی کی آنکھوں میں آئی اور دِل نیک سائیں کا ڈولنے ڈوبنے لگا۔

وہ چق اٹھا کر باہر نکلی۔ وزیر باتدبیر پھر چبوترے پر آبیٹھا اور جمائیاں لینے لگا تھا۔ وزیر باتدبیر سے رجوع کرتے ہوئے بولی: "کُتّی دے پُتر! بازار سے تیرا باپ سودا لاکر دے گا؟"

"ہی ہی ہی سرکار! باپ تو میری ماں کو ہی سودا لاکر دے سکتا ہے۔ تیرا سودا تو میں لاکر دوں گا۔"

اور پھر وہ لڑکھڑاتا لڑکھڑاتا بیس گز کے فاصلے پر تنیس بار گرتا پڑتا آیا۔ وہ بولی، کنجر بھنگ بھی پیتا ہے تو تانبے کی پیٹھ والی، پھر سنبھلا بھی نہیں جاتا۔" کنجر ہی ہی کرتا رہا۔ اس نے لات ماری تو وہ اوندھے منہ گرا اور پھر گھٹنے سہلاتا سہلاتا اُٹھا۔ دس کا نوٹ لیا اور بازار چلا گیا۔

غسل کے بعد وہ صیقل کی ہوئی تلوار تھی، انگ انگ سے تھکن نکل گئی، اب وہ گھر کی ملکہ تھی بلکہ یہ گھر اسی کے لئے بنایا سجایا گیا تھا۔ نیک سائیں کو اسی کی معرفت اس گھر سے دلچسپی تھی اور نیتی پیرنی کو اسی گھر کی معرفت نیک سائیں سے دلچسپی تھی۔ جمیلہ کو ترک کرنے میں اس گھر کا بھی ہاتھ تھا۔ دراصل لنڈی کوتل، کعبہ اور اس گھر نے مل کر جمیلہ کا گھر اُجاڑا۔

نیک سائیں نے میز پر بوتل دھری اور دونوں نے مل کر سگریٹ سلگایا۔ دونوں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ گئے۔

"کیا حال ہے ٹبّی کا؟" نیک سائیں نے بوتل گلاس میں انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"لڑکیاں اور رنڈیاں ایک ہوگئی ہیں۔ سب ٹیڈی بن گئی ہیں۔"

"اب تو پیسہ بھی ٹیڈی ہوگیا ہے۔ جبھی تو قدر نہیں رہی کسی چیز کی۔"

"خاک قدر ہے کسی چیز کی، یہ چودھویں صدی ہے۔ چودھویں صدی۔"

"ٹبّی اُجڑ رہی ہے لیکن ہوٹل کھل رہے ہیں۔ گھر گرہستنیں ناچ گانا سیکھ رہی ہیں۔"

"مطلب یہ کہ شریف اور بدمعاش ایک گھاٹ پانی پینے لگے ہیں۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کیا ہوگیا ہے زمانے کو کھاتے پیتے گھروں کی یہ لڑکیاں! یہ رنڈیوں کی اولاد تھوڑی ہیں لیکن ان کے اندر کیسی بانکی رنڈیاں جاگ اُٹھی ہیں۔"

نیک سائیں حقیقتِ حال سے آگاہ تھا اور ٹیڈی ازم کا حامی۔ جب سے عورت ٹیڈی ہوئی سمگلنگ کا دھندا بڑھا۔ اور پھر ہر عورت رنڈی تھی، ہر رنڈی عورت۔ کوئی عورت کم ہوتی ہے رنڈی زیادہ، کوئی رنڈی کم ہوتی ہے عورت زیادہ، موقعے موقعے کی بات ہے لیکن عورت سے زیادہ ٹیڈی، رنڈی سے زیادہ قریب ہے اور قربِ قیامت کی یہ بھی ایک علامت ہے۔

نیتی پیرنی نے ایک پیگ چڑھایا اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، "سر پہ نانکہ نہیں، استاد نہیں۔ اب ان ٹیڈیوں کو کون نکیل دے۔"

"بیبتیے! زمانہ تو دیکھ کون سا آن لگا ہے۔ اب تو عورتیں مردوں کو نکیل دیئے پھرتی ہیں۔"

"عورت گھر سے باہر نکل آئی ہے۔ ہر طرف تماشا ہونے لگا ہے۔ اب مرد کیا خالی گھر میں رہے؟"

"جہاں عورت وہاں مرد۔"

"گھر خالی ہو رہے ہیں، ہوٹل آباد ہو رہے ہیں۔ جتنے زیادہ ہوٹل بڑھتے ہیں اتنے ہی زیادہ گھر خالی ہوتے ہیں۔ ہوٹلوں میں دل بہلاوے کے کھلونے مل جاتے ہیں مردوں کو۔"

"ٹبّی کا تو خواہ مخواہ نام بدنام ہے۔ اسے سرکار توڑ ہی دے تو اچھا ہے۔"

"ٹبّی ٹوٹ رہی ہے۔"

ٹبّی ٹوٹنے کی خبر پر نیک سائیں کو دلی طور پر خوشی ہوئی۔ اس کی تو آرزو ہی یہ تھی کہ ٹبّی کی اینٹ ٹوٹ کر اس کے چوبارے میں لگ جائے اور پھر تینتی پیرنی یہیں کی ہو رہے۔ اس نے تو منت مانی تھی کہ جس دن ٹبّی ٹوٹی وہ دیگیں چڑھائے گا۔

ایک مدت تک تکیے کا خوشنما کمرہ سنسان پڑا رہا لیکن تینتی پیرنی کے قدم دھرتے ہی مسکرانے لگا جگمگانے لگا۔

رات انتہائی دلفریبی سے آئی۔

رات آئی، رات جب کچھ لوگوں کے دل بیدار ہوتے ہیں۔ کچھ کے بدن بیدار ہوتے ہیں۔ جو سو جاتے ہیں ان کی روحیں ویرانوں میں بھٹکتی پھرتیں یا پھر ارمانوں کے جزیروں میں۔ تینتی پیرنی کا بدن بیدار تھا اور اس کے لہو کی حرارت شراب کے شعلوں کی لپک سے ہم آہنگ تھی۔ سلگتی ہوئی بو، اس کے پنڈے کی چراند کمرے میں جذب ہونے لگی اور پھر نیک سائیں کے جذبات نے بھی لَو پکڑ لی۔ دونوں شراب کے نشے

میں جلنے لگے۔ رات بھر چتا جلتی رہی۔ چراند اڑتی رہی۔ صبح ہوئی تو چتا بجھ گئی اور دو یخ بستہ بدن قالین پر ادھ موئے پائے گئے۔ قریب ہی شراب کے برتن پڑے تھے۔

باہر تکیے میں نصرو حسبِ معمول ڈنٹر پیلنے کے بعد ہاتھوں سے اپنی چمکیلی رانیں آہستہ آہستہ مگر زور زور سے مسل رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے آویزاں تھے بدن پر جوانی چمک رہی تھی۔ وہ ہر روز بڑے خضوع و خشوع سے پیڑ تلے آکر پہلے بدن کی مالش کرتا پھر کسرت کرتا اور آخر میں رانیں مسلتا۔ یہ اس کی عبادت تھی۔ اسے یہ نکتہ اچھی طرح معلوم تھا کہ صفِ اوّل کا غنڈہ بننے کے لیے بدن کمانا پڑتا ہے۔ البتہ یہ اسے ابھی معلوم نہ تھا کہ بدن کا بانکپن لڑکیوں کو چت کرتا ہے۔

اس کی ساری سوچ ایک ہی نقطے پر سمٹ آئی اور وہ گردوپیش کی دنیا سے بے خبر اپنے بدن کی شادابی اور لہو کی تابانی کے نظارے سے آپ ہی چت ہوتے لگا۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ نیتی پیرنی اسے تک رہی ہے۔ پل بھر کو اُس کی نگاہیں اِس کے بدن سے نہیں ہٹیں۔

نیتی پیرنی خوش ذوق تھی۔ وہ بھی حُسن و جوانی کی نگہداشت کے راز سے آگاہ تھی قدرت نے اسے اچھا بدن دیا تھا۔ اچھی شکل و صورت عطا کی تھی۔ اس کے نزدیک اسے نکھار سنوار کر رکھنا کارِ ثواب تھا اور کارساز کی منشا کے مطابق۔ انہیں بگاڑنا گناہ تھا۔

نصرو کو ورزش کرتے دیکھ کر نیک سائیں بھی مسرور ہوا۔ کبھی نصرو مریل سا لڑکا تھا اس کی ہڈیوں پر گوشت کے بغیر ہی چمڑا مڑھا تھا۔ نیک سائیں کے زیر ہدایت نصرو نے گوشت پوست کو ترقی دی۔ یوں نئے نصرو نے جنم لیا۔ نیا نصرو درحقیقت نیک سائیں

کی تخلیق تھا۔

نبک سائیں کے بدن پر صرف لنگوٹ تھا۔ ہاتھ میں پیئرز سوپ کی ٹکیہ تھی جو چاندی کے سوپ کیس میں دھری تھی۔ نبک سائیں کا لنگوٹ دیسی وضع کا تھا لیکن مزاج بالکل ولائتی تھا اور یہ ولائتی مزاج اسے لنڈی کوتل سے ملا تھا۔ لنڈی کوتل اس کے قدموں میں تھا۔

موتی شاہ نے بھی حسرت بھری نظروں سے نصرو کا بدن دیکھا۔ اس کے دل میں امنگوں کا طوفان مچل گیا۔ اور اس طوفان کے گرد ماضی کے دھندلکے لپٹ گئے۔ نصرو کے بدن میں بجلیاں تڑپ رہی تھیں اور ان سے پھوٹتی ہوئی جوت اس کا مستقبل جگمگا رہی تھی۔ موتی شاہ بھی کبھی یونہی جوان تھا اور اس کے بدن نے بھی کبھی جوانی کے بیل کو بے پناہ قوت دی تھی۔ لیکن پھر جوجی مر گیا اور اسے تکیہ کھا گیا۔ رنڈی کو چوبارہ کھا جاتا ہے۔ غنڈے کو تکیہ۔ رنڈی چوبارہ نہیں چھوڑتی۔ غنڈہ تکیہ نہیں چھوڑتا۔ انہیں بیٹھنے کو تو ضرور جگہ چاہیئے تھی۔

جوجی حسین اور نازک مزاج تھا۔ لانبا قد، پتلا جسم، بڑی بڑی آنکھیں، دانت چمبے کی کلیاں۔ ہر وقت ہنستا رہتا۔ موتی شاہ اسی ادا پہ فریفتہ تھا۔ جوجی کو اختیار تھا کہ بازار کی جس دکان سے چاہے سودا لے۔ جو چیز چاہے اٹھا لے۔ جسے گالی دے وہ چپ چاپ سن لے۔ جسے پیٹنا چاہے وہ شرافت سے پٹ جائے۔ اس کی پٹائی میں صرف موتی شاہ کی صرف وجاہت ہی شامل نہ تھی۔ اس کے کماتی دار چاقو کا دبدبہ اور خوف بھی شامل تھا۔ جوجی کبھی جلال میں آتا تو اس کا گلابی چہرہ تمتما کر لال گلاب بن جاتا اور دیکھنے والا اسے گلے لگانا چاہتا تھا۔ اور یہ جلال تو بس گھڑی دو گھڑی ہی کا ہوتا، پھر وہی لال شعلہ

گلابی تاڑ پر آجاتا۔ جو جی کیا مرا، بازار مر گیا۔ موتی شاہ مر گیا۔ اس کا جنازہ اس دھوم سے نکلا جیسے کسی ہیرو کا جنازہ ہو۔ موتی شاہ دل شکستہ ہو گیا، ہاتھوں میں سکت نہ رہی اس نے کمانی دار چاقو پھینک دیا۔ تکئے کی مٹی میں مل کر مٹی ہوا۔ آج جو اس نے نصرو کا سجرا بدن دیکھا تو وہ تلوار تھا۔ اس کے بدن میں نصرو کا بدن ہلکورے لینے لگا۔ اس کے بدن میں ہلچل سی مچی۔ اس نے ہوا میں بازو لہرائے۔ کھڑے کھڑے دوڑ لگائی۔ نصرو اس حرکت پر ہنسا اور پھر اس کی ہنسی قہقہوں میں بدل گئی۔ ان قہقہوں کی چوٹ موتی شاہ کے دل پر لگی جو اس نے نوٹ کر لی۔

نیتی پیرنی کے بال کھلے تھے۔ سر جھٹکتی تو لٹیں تملا اٹھتیں۔ سامنے سے گریبان کھلا تھا اور ویسے تو سارا بدن ہی کھلا تھا۔ وائل کی قمیض سے کیا ڈھکتا چھپتا۔ کپڑے تو جیسے اسے چبھتے تھے۔ یوں تو کھلے گریبان پر ہر کسی کی نگاہیں جا سکتی تھیں لیکن اس تک پہنچنے والا تکئے کی حدود میں کہیں نہ تھا۔ یہ شرف تو صرف نیک سائیں کو ہی حاصل تھا اس کے شاداب ریشمیں بنڈے کو چھو سکے۔ نیتی پیرنی موت تھی قریب آنے والے کے لئے، انجانے میں ہر کسی کو ڈس لیتی۔ نصرو کو قہقہہ لگاتے دیکھا تو اس نے گریبان کچھ اور کھول دیا۔ اور پورے تکئے کو فیر کی زد میں لے لیا، موتی شاہ پر قہر آلود نظریں ڈالتی ہوئی نصرو کے پاس چلی گئی اس کے حضور میں ایسا بھرپور بدن تھا جس کا انگ انگ جوانی سے لبریز تھا۔ ایک خفیف سی خراش / زخم کا معمولی سا نشان بھی نہ تھا کہیں۔ ہنستا دمکتا ہوا چاند۔

"یونہی ہنسا کر۔ قہقہے مارا کر۔ بڑا اچھا لگتا ہے تو۔" نیتی پیرنی نے بالوں تلے سگریٹ مسلتے ہوئے کہا۔

"بربی بی! موتی شاہ کیوں جلتا ہے مجھ سے؟ اسے میری ہنسی اچھی لگتی ہے، نہ قہقہے اچھے لگتے ہیں"

"اس کا جوجی جو مر گیا ہے۔ وہ تو پاگل ہے، پاگل۔ جوجی کی یاد میں گھل گھل کر پھوکا ہو گیا ہے۔ اس کے اندر کچھ نہیں رہا۔ ہڈیوں سے گودا بھی نکل چکا ہے۔ جوانی اور جوجی کو یاد کرتا رہتا ہے"

"جوانی کے لیے بڑی جان مارنا پڑتی ہے بی بی! جان بنانا کھیل نہیں"

"ٹھیک کہتا ہے تو نصرو!"

ادھر مکالمہ ہو رہا تھا، ادھر کنوئیں پر مولا ملنگ بو کے نکال نکال کر نیک سائیں پر پھینک رہا تھا۔ نیک سائیں نہاتا کم اور نیتی پیرنی کو دیکھتا زیادہ تھا۔ نصرو بھی اس کی نگاہ میں تھا اور کیسے نہ ہوتا؛ نیک سائیں اس کا خالق تھا اور اب اسے اپنے منصوبوں کا معمار سمجھتا تھا۔ اس کے خیال میں ابھی نصرو کے چالو ہونے اور اس کے کام کی رسم افتتاح کا وقت نہ آیا تھا۔

نیتی پیرنی نے ایک بار پھر نصرو کا بھرپور جائزہ لیا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چلی گئی۔

نیک سائیں نہا کر وزیرِ باتدبیر کے پاس چلا آیا۔ نصرو کنوئیں پر چلا گیا۔

نیتی پیرنی نے اندر سے مولے ملنگ کے ہاتھ حلوے پوری کا طباق بھیجا۔ چائے کی چینک خان کی دکان سے آگئی۔

نیک سائیں پر ابھی تک فاتحانہ کیفیت سوار تھی۔ اس نے موتی شاہ کی ران پر ہاتھ مار کر کہا۔ "مولا جانے! عورت کو جوتی تلے دبا کر رکھتا ہوں — کیا مجال ہے
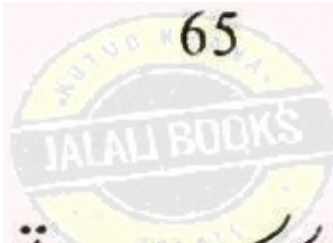
جائے اور لوٹ نہ آئے "

" او ئے آہو بادشاہ! نینتی پیرنی کی کیا ہستی ہے جو تجھ سے مقابلہ کرے "

" مقابلہ! توبہ توبہ کرکے کہتا ہوں۔ جس عورت کا ایک دفعہ کلاوہ بھرا ہے۔ وہ دوبارہ کسی دوسرے کے پاس نہیں جاتی "

" کیا کہنے تیرے بادشاہ!"

قسم ہے مولا کی! رستم کی بھی عورت ہو تو اسے لونڈی بنا لوں۔ اللہ معافی دے ماں کا یار ہوں، ماں کا یار!"

" مجھے خبر ہے تیری بادشاہ! گلی کی عورتیں تجھ سے پناہ مانگتی تھی "

" گلی کو تو جنگل کر دیا تھا میں نے۔ قسم پروردگار کی! ابھی منڈوے میں ہوتا تھا کہ گلی کو میری خبر ہو جاتی تھی اور پھر ادھر رنڈیوں نے میری شکل دیکھی۔ ادھر ہاتھ باندھ کے کھڑی ہو گئیں "

" تجھ سے ڈرتی تھیں بادشاہ!"

" معتی شاہ! کبھی مفت بڑی نہیں لڑائی - پہلے ناک پر دھا کا رکھتا تھا۔ پھر رنڈی کی دہلیز پر پاؤں دھرتا تھا "

بڑی بڑی رنڈیاں پاؤں پکڑتی تھیں۔

" نینتی پیرنی گھٹ تھی کسی سے "

" جواب نہیں اس کا۔ خدا کی قسم ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ بڑی منہ زور تھی۔ دس روپے روز دیتی تھی کرایہ چوبارے کا۔ بڑی بج سنور کے بیٹھتی تھی۔ اپنے مفت بر کو چاقو مار دیا تھا اس نے۔ اتنی تو ہنہ چھوٹ تھی۔ مغرور اتنی تھی کہ آنکھ بھر

کر نہیں دیکھتی تھی تماش بین کو۔ لیکن دیکھ لے، رام کر لیا ہے اسے!"

"اوئے نہیں جواب تیرا بادشاہ!"

"مولاجانے باندھ دیا ہے پیرنی کو۔ ہل نہیں سکتی۔ دو دفعہ بھاگی ہے لیکن آپ ہی واپس بھی آگئی ہے۔ میرے یار اس کی کیا ہستی ہے کہ یہاں سے جائے؟ عورت تو میری مٹھی میں ہوتی ہے۔"

پوری حلوہ ختم ہوا تو باتیں بھی ختم ہوئیں۔ مولا ملنگ طباق لے کر اندر گیا تو نیک سائیں کی باتیں بھی اندر لے گیا۔ طباق رکھتے ہی اس نے ساری باتیں اگل دیں۔ ایک ایک بات زہر میں بجھا ہوا تیر تھی، ہر بات دل میں چبھی۔ نیتی پیرنی نے اسے بالوں سے گھسیٹا اور دو تین دو چار لاتیں جڑیں۔

"بدبخت، نمک حرام! تیرے منہ سے میری حمایت میں کوئی بات نہ نکلی۔ تو نے وہیں دتے کا منہ نہیں توڑا جب وہ میرے خلاف زہر اگل رہا تھا۔؟"

مولے ملنگ نے روتے روتے کہا۔ "بی بی! دلا بڑا جبردست ہے۔"

"جانتی ہوں اسے۔ بنا پھرتا ہے زبردست تجھ ایسے کے لیے۔"

"بی بی، وہ کسی سے ڈرتا نہیں جاتا۔"

"رنڈی کے! نیتی پیرنی اسے دل کے دکھائے گی۔ دیکھنا کیسے شہ رگ دباتی ہوں۔ لوٹتے چھتر کی طرح بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔"

مولا ملنگ ایک جانب ڈر سہم کر بیٹھ گیا اور دیکھنے لگا کہ شعلوں بھری یہ آندھی کب تھمے گی۔

وہ سچ مچ آندھی ہی تھی لیکن اس کی رفتار زیادہ نہ تھی کیونکہ جس قالین پہ آندھی

چل رہی تھی وہ بہت ملائم تھا، بالوں کی گپھاؤں سے ریشمی دلدل بن گئی تھی، اس میں آندھی کے پاؤں دھنس دھنس جاتے۔ یہی ریشمی دلدل نیک سائیں کی حمایت میں خاموش آواز بن کر اس کے دل و دماغ میں اُتر گئی۔ وہ غصّے کے مارے قالین کو کھوندتی رہی اپنی دانست میں وہ نیک سائیں کو قدموں تلے روندتی رہی جس نے کمرے میں اس کے حضور سارا لنڈی کوتل رکھ دیا تھا۔ کوچ پر دھم سے گری تو اسے ہلکے ہلکے، نرم نرم جھٹکے لگے جیسے نیک سائیں نے اسے جھولا جھلایا ہو۔ اس کی آنکھوں میں گلی کا وہ چوبارہ گھوم گیا جو بڑا بھاگوان تھا اور جہاں شام کو روشنی کے پھول کھلتے ہی تماش بین کی آرزوئیں اس کے گرد ہالہ بنا لیتیں۔ وہ اجالے کے قلعے میں رانی بنی بیٹھی رہتی اور لوگ جھروکہ درشن کے لیے بار بار چکّر کاٹتے رہتے۔ دہلیز پر وہی پاؤں دھرتا جو راجہ ہوتا۔ دوسرے تو بس دُور رہی سے آنکھ مار کر جی خوش کر لیتے اور اس کی دہلیز پر پاؤں دھرنے کی تمنا لے کر چلے جاتے لیکن اَب تبتی اُجڑ رہی تھی۔ قلعہ برباد ہونے کو تھا۔ ہر صبح تباہی کی خبر لاتی اور اسے نیک سائیں سے قریب تر کر دیتی۔

سگریٹ پیا، پیالہ پیا۔ کچھ جی ہلکا ہوا۔ پھر صندوق میں سے دس دس کے نوٹ نکال کر مولے ملنگ کے ہاتھ جمیلہ کو بھجوائے۔ مولے ملنگ نے جاتے جاتے کہا۔ "بڑی نیکی کماتی ہے تو بی بی! جمیلاں بچاری کا اس دنیا میں کون ہے؟ ابھی تو اس کے بچے بھی جوان نہیں ہوئے۔"

چاند بھرپور رعنائی کے ساتھ طلوع ہوا۔ ملنگ سرور میں آئے۔ چاند انہیں محبوب تھا، ہجر و فراق کا ساتھی تھا۔ خوبصورتی کی علامت اور بس اس کی کرن کلیوں سے زمین و آسمان جگمگا رہے تھے۔ یہ کرن کلیاں تو ملنگوں کی محفل سجا رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر قوالوں

نے بارہا انتہائی جوش و خروش سے نعرے لگائے اور ملنگ بھنگ کا پیالہ پی خیال کی سیڑھی لگا، آسمان پر چڑھے اور ستاروں پر کمند ڈال آئے۔ بھنگ کا پیالہ پی کر وہ ڈھے جاتے اور ان کے خیال سپوت نک بن جاتے۔

رات کو ملنگ سرور میں آئے اور قوالی کی محفل جمی۔ دو ملنگ لڑکھڑا لڑکھڑا کر رقص کرنے لگے۔ ویسے ہر ملنگ جھوم رہا تھا۔ ہر بول اور گھڑے کی ضرب جیسے روح میں جھوم رہی تھی اور پھر پوری کائنات گھوم رہی تھی۔ موتی شاہ کے گلے میں نور تھا۔ اس کی آواز نے جادو جگایا اور سریلی آواز نے سب کو سرمست کر دیا، مستی سرمستی میں بدل گئی۔ نیک سائیں کی آواز بھی کم دلکش نہ تھی۔ سرمستی نے رقص کرنے والے ملنگوں کا انگ انگ توڑ دیا، وہ گر گئے اور فرش ہو گئے۔ وہ ملنگ ہی تو تھے افریقہ کے جادو پرست تو نہ تھے جو چاندنی میں دیوتا کو زیر کرتے اور کھپنیاں لہلہانے کے لیے رات رات بھر ناچتے اور تھکنے کا نام نہ لیتے۔ یہ تو بھنگ پی کر خود ہی زیر ہو جاتے، دیوتا کو کیا زیر کرتے۔

نغمہ عروج پر تھا تو نصرو بھی آ گیا۔ وہ گھوڑا بوسکی کی بے داغ، بے سلوٹ چمکیلی قمیض پہنے ہوئے تھا، ہرے پلّو والا ریشمی لاچا باندھ رکھا تھا۔ چاندنی رات میں بھی اس کے چہرے پر آفتاب کی تمازت تھی۔ ہوا سے دھوتی سرکتی تو اس کی پنڈلیوں کا شکار دور دور پڑتا۔ اب تو نیتی پیرنی بھی باہر آ کر چبوترے پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں رہ رہ کر نصرو کی تنی ہوئی گردن اور چوڑی چکلی چھاتی پر جاتیں۔ یہ سجرا سجیلا بھرپور بدن جس پر کوئی داغ دھبہ نہ پڑا تھا۔ اس کے دل میں پیوست ہو گیا۔ کھنکتی ہوئی جوانی کے اس چھلکتے ہوئے ساز کو ابھی کسی نے بیدار نہیں کیا تھا۔ نصرو ایک تیز خواہش بن کر نیتی پیرنی کے بدن میں تیر گیا۔ اس نے نصرو کو ٹپکے کا آم سمجھ لیا جو ٹوٹا تو اس کی جھولی میں گرے

گا۔

نصرو مستوں اور سُر مستوں کے حلقے میں بیٹھ گیا۔ موتی شاہ اور نیک سائیں کی آواز کا جادو اس پر بھی چل گیا۔ وہ بھی سُر مستی میں جھومنے لگا۔ موتی شاہ نے ذرا دم دبا کر سگریٹ میں چرس بھر لی۔ سلگا کر چار کش لئے اور نصرو کے کان میں کچھ کہہ کر سگریٹ اسے تھما دیا۔ نصرو نے کش لیا ہی تھا کہ وہ لپک کر آئی۔ جھپٹ کر اس نے سگریٹ چھین لیا اور جُوتی سے مسل دیا۔ اس وقت نیتی پیرنی کا چہرہ چنگاری تھا اور دل کی دھڑکن تیز تھی کولہے پر ہاتھ رکھ کر دو چار گھڑی کھڑی رہی اور پھر اس کا سارا غصہ اس کی دائیں ہتھیلی میں کھینچ آیا۔ آگ سے لبریز طمانچے موتی شاہ پر بے تحاشا برسنے لگے۔ نیک سائیں ہاتھ نہ پکڑتا تو جانے کب تک مشق جاری رہتی۔ نیک سائیں بڑی مشکل سے اسے حلقے میں سے لے گیا۔ کمرے میں جا کر اسے کوتج پر بٹھا دیا۔ غصّے کے مارے اس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ بھرپور عورت تھی، رنڈی تھی، رنڈی کا غصہ عورت کے غصّے سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ یہ اندر سمٹنے کی بجائے باہر چھلک آتا ہے۔

نیک سائیں نے غصہ اگلوانے اور اسے ہلکے تاؤ پر لانے کے لئے بات چھیڑی ”دلبر جانی! نصرو کو بھی چار چانٹے لگا دیئے ہوتے۔“

”اس کے تو میں بال نوچ لیتی وہ تو وہاں سے کھسک ہی گیا۔“

”موتی شاہ چنگا مندا دیکھتا ہی نہیں۔ ہر کسی کو چرس پر لگا دیتا ہے۔“

”کمینہ۔ سونے سی جوانی کو داغ لگانا چاہتا تھا۔ وہ معصوم لڑکا، اٹھتی جوانی اسے کیا خبر یہ زہر ہے۔“

”نصرو تو میری آس ہے رانی! جوان ہے! جیدار ہے۔ ایک دن اپنا سارا دھند

پر چھوڑ دوں گا۔"

"اور تو چین کی بنسری بجائے گا۔ تکیے میں بھنگیوں چرسیوں کے ساتھ پڑا رہے گا۔؟"

"وہ کیوں؟ جب کبھی ڈھیر سارا مال لاتا ہوگا۔ میں آپ جاؤں گا۔"

"ہوں۔"

نصرو کے بارے میں تیتی پیرنی کو نیک سائیں کی نسبت کا پتہ چل گیا۔

لگلے روز اجنبیوں کی ایک ٹولی آئی اور نیک سائیں کو اپنے ساتھ لے گئی۔ کام خطرناک اور چوکھے سودے کا تھا۔ اس میں فقط دلیری کام نہ آتی۔ عقل، رسوخ، تجربے اور حاضر دماغی کی ضرورت تھی۔ یہ علم دوسرا تھا جس کی تربیت نیک سائیں نے زندگی کے خارزار میں پائی تھی۔

تکیہ خالی خالی تھا۔ مونی شاہ بھی مہم پر گیا تھا اور نصرو حسب معمول کسرت کر رہا تھا۔

تیتی پیرنی اس کے پاس چلی آئی۔ سرِدست اس نے اس کے بال نوچنے نہ سگرٹ والی بات چھیڑی۔ اس وقت وہ کیسے غصے میں آتی۔ نصرو تو اس کے دل میں مچل رہا تھا۔ بولی، "اڑیا! میرے ساتھ تو چلنا، کام ہے مجھے۔"

نصرو کی آنکھیں جھک گئیں اور اس پر شرم کا بوجھ پڑ گیا۔ وہ تو اس کے سایے تلے دب ہی گیا۔ شرم تو چیز ہی ایسی ہے کہ جوانی کی صبح اولیں میں کلی بن جاتی ہے اور پھر عورت کی سانسوں کی گرمی سے ایک دن چٹک جاتی ہے۔ تب شرم لبو بن کے اڑتی ہے۔ وہ شرم کے مارے ادھ موا ہو کر رہ گیا۔ اس کی زبان سے صرف "اچھا" نکلا اور وہ بھی بڑی دھیمی آواز میں۔

نیتی پیرنی پھول تھی، پھول مسکرایا۔ اس نے اپنی دو انگلیوں سے اس کی ٹھوڑی اونچی کی اور اس کی جھکی ہوئی آنکھوں کو اپنی آنکھوں کے متوازی لے آئی۔ ٹھوڑی تھامے رہی۔ مبادا پھر آنکھیں جھک جائیں۔ اس کے بدن میں جھرجھری سی آئی اور چہرے پر سُرخی سمٹ آئی۔ وہ مسکرایا اور اس نے نیتی پیرنی کی نظروں سے نظریں ملائیں۔ جلوے سرور سے لبریز ہو گئے۔

"کیوں رے نصرو اس ماں کے یار سے سگرٹ کیوں لیا تھا۔؟"

"اس ماں کے یار نے کہا تھا، چرس کا سگرٹ پیتے ہی سورگ میں پہنچ جائے گا۔"

"ہونہہ، کمینے کم ذات نے بات بھی کی تو کیسی۔ حرامی سورگ میں پہنچ جائے گا۔ سورگ میں پہنچاؤں گی تجھے۔"

"سچ؟"

"سچ"!

"کب؟"

"آج لیکن قسم کھا میری جان کی کہ کبھی سگرٹ نہیں پیئے گا، چرس والا نہ خالی۔"

"تیری جان کی قسم! سگرٹ نہیں پیوں گا۔ نہ چرس والا نہ خالی۔"

"بس اب سورگ تیرا ہو گیا۔ جھٹ سے نہا لے۔ بازار ہو آئیں۔"

نصرو بدن کی حرارت کم کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔

نیتی پیرنی کمرے میں چلی گئی تاکہ اپنے رانجھے پر جادو کرنے کے لئے ہیر سے بھی زیادہ خوبصورت بن جائے۔ اس نے غسل کیا اور نئی شادابی سے طلوع ہوئی اپنے آپ کو خوشبوؤں میں بسایا۔

اس کے اندر بدن بول رہا تھا۔ چاروں طرف خوشبو کے بھنور ناچ رہے تھے کپڑے پہن کر وہ بیس سال کی تتلی بن گئی۔ نصرو نے اس میں جوانی کا احساس جگا دیا ہاتھوں کی رگیں چھپ تو نہ سکیں لیکن اس کے ہونٹوں پر کھلے ہوئے پھولوں اور دانتوں کی چمپا کلی نے اسے سجا کر دیا۔

دونوں بازار چلے گئے۔ اس کے بدن کی مہک سرور بخش تھی۔ نصرو بیچ نچ سورگ میں پہنچ گیا۔ سورگ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے پاؤں تو جیسے زمین پر ٹکتے ہی نہ تھے۔ اس کے وہم و گماں میں نہ تھا کہ نیتی پیرنی ایسی ذیشان عورت اسے شرف رفاقت بخشے گی۔ وہ کب جانتا تھا کہ جوانی ایک میں غرور لاتی ہے، ایک کا غرور توڑتی ہے۔ وہ بار بار گردن تان کر نگاہیں اونچی کرتا لیکن گردن اپنے آپ جھک جاتی۔ نگاہیں نیچی ہو جاتیں۔ نیتی پیرنی کی بڑی بڑی آنکھوں سے چمکتی ہوئی کرنیں اکہرے مہین نقاب میں سے چھن چھن کر باہر آ رہی تھیں اور دیکھنے والا ان کے تعاقب میں تھا۔ بستے حلوائی کے تھڑے پہ خیرا جھرنی والا اور اس کے دو ساتھی بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے نصرو کو عورت کے ساتھ جاتے دیکھا تو حیران ہوئے۔ انہیں امید نہ تھی کہ نصرو اتنی جلدی پر پرزے نکال لے گا۔ خیرے جھرنی والے نے کھانس کھنکار کر گلا صاف کیا اور پھر ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ”معشوق نمبر ون ہے۔“

نصرو نے سنا تو اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔

پھر اس نے کہا۔ ”اس معشوق کے لیے جان بھی دینی پڑے تو پرواہ نہیں۔“ نصرو کا چہرہ اور بھی تمتمایا لیکن وہ چپ رہا۔ دراصل وہ اتنی جلدی پر پرزے

نکالتے پر جھینپ سا گیا تھا۔ نیتی پیرنی پر دو چوٹیں ہوئیں اور وہ چپ رہا۔ اس نے نقاب الٹایا اور نصرو سے کہا۔

" کھینچ کمینے بدذات کی کھال، دیکھتا کیا ہے ؟"

یہ جملہ بجلی کا بھالا تھا جو اسے جا چھ۔ وہ بجلی کا بھالا بن گیا اور بجلی کا بھالا اس نے خیرے چھرنی والے کو چبھو دیا۔ وہی چاقو جو انتڑیاں کاٹ پھینکتا۔ خیرے چھرنی والے کے پینترا بدلنے پر اس کی ران چیر گیا۔ اس کی دھوتی خون سے لت پت ہو گئی۔ چاقو تو خیرے چھرنی والے کے پاس بھی تھا لیکن ڈب ہی میں رہا۔ نصرو کی کلائی کا زور دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ نصرو کا بازو اس تیزی سے حرکت میں آیا کہ سب دنگ رہ گئے۔ اس کی کلائی میں نیا کس بل تھا اور اس کی انگلیوں کی گرفت اتنی زبردست تھی جیسے وہ آدمی کو نہیں سانڈ کو مارنے چلا تھا۔ ٹیڈی باٹی ٹیک نے آنکھ ماری پھر گالی دی۔ پھر دھکا دیا اور خیرا چھرنی والا بھاگ گیا۔

نصرو نے چاقو ہوا میں لہرا کر کہا " او بھگل "!

بھگل نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ گلی میں مڑ کر غائب ہو گیا۔ نصرو نے سینہ تان کر کہا۔ " عورتوں کی کمائی کھانے والے یہ کیا لڑیں گے مجھ سے "

ٹیڈی باٹی ٹیک نے ہاں میں ہاں ملائی۔ اس نے ہوا کا بدلتا ہوا رخ دیکھ لیا تھا۔

نیتی پیرنی نے نصرو سے چاقو لے لیا اور اسے لے کر چلی گئی۔

خیرے چھرنی والے کے بڑے تور تھے۔ بستہ ب کا یہ بدمعاش بستہ الف میں ترقی پانے کے لیے بے تاب تھا، لیکن نصرو نے کرکری کر کے اس کی ترقی کے

راستے بند کر دیئے اور اس کا مستقبل تاریک کر دیا۔ علاقے کے وہ لڑکے جو اس کے شاندار مستقبل، بڑھتے ہوئے رسوخ اور پھیلتے ہوئے کاروبار سے متاثر ہو کر دھڑا دھڑ اس کے حلقۂ ادب میں داخل ہوئے اور اس کے حکم سے وارداتیں کرنے لگے تھے۔ بدظن اور بددل ہو گئے۔ اس کا تو سارا طلسم ہی ٹوٹ گیا۔ ادھر نیتی پیرنی کے دل پر نصرو کی دھاک کچھ اور بیٹھ گئی۔ اب وہ اکثر نصرو کو لے کر بازار میں سے گزرتی۔ کسی کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے اور آوازہ کسنے کی جرأت نہ ہوتی نیتی پیرنی نے ایک اور نگہبان پا لیا۔ وہ اسے ہر وقت خوش رکھتی۔

سورگ میں رہتے رہتے اس میں اکتاہٹ آگئی۔ آدمی سورگ سے بھی اکتا جاتا ہے۔ اس میں اسیری کا احساس بھی شامل تھا۔ آخر ایک دن اس نے کہا،

"میں فس کلاس پشوری تانگہ لوں گا۔"

"مال ہے۔؟" نیتی پیرنی نے پوچھا۔

"چاچے سے لے لوں گا۔ گھوڑی اس کے پاس ہے، نمبری تانگہ وہ لے دے گا۔ تجھے تانگے میں بٹھا کر نکلوں گا تو مزہ آجائے گا۔"

"تانگے گھوڑے کے اب دن لد گئے۔ سکوٹر لے لے۔"

"سکوٹر کے لیے چاچا دھیلا نہیں دے گا۔"

"دام تیک سائیں سے لے دوں گی۔ پہلے کہیں سے سکوٹر چلانا سیکھ اور پھر میں تجھے آپ چل کے سکوٹر خرید دوں گی۔"

"سچ؟"

"سچ!"

نصرو کے لیے تو سکوٹر بہت بڑی نعمت تھا۔ آدمی کو کار اور کوٹھی پا کر مستی اور خرمستی کی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ لڑکے کو سکوٹر پا کر حاصل ہوتی ہے۔ وہ فیروز فرنٹیئے کے ڈرائیونگ سکول میں سکوٹر چلانے کی تربیت پانے لگا۔ سکوٹر اس کا خواب تھا، دلفریب خواب اور وہ سوچنے لگا۔ جب وہ نینی بیرنی کو پیچھے بٹھائے گا، نینی بیرنی اپنی باہیں اس کی کمر میں ڈال دے گی اور وہ سکوٹر اڑاتا جائے گا تو کتنی اونچی ہواؤں میں اڑنے لگے گا۔ بالکل سورگ میں ہو گا وہ سکوٹر بھر پری اڑائے گا اور فٹ پاتھ پر چلنے والی دنیا اسے رشک کی نگاہ سے دیکھے گی۔

نیک سائیں کو گئے کئی دن ہو گئے تھے لیکن اس میں تشویش کی کوئی بات نہ تھی۔ وہ منڈی کوتل سے سیدھا کراچی چلا گیا ہو گا۔ وہاں سے اور کہیں نکل گیا ہو گا بڑا کائیاں تھا۔ اس کے پاس مہم جوئی کے لیے عقل، تجربے اور حاضر دماغی ایسے تین حربے تھے۔ یونہی تو روپے کی ریل پیل نہ تھی۔ نینی اس کے گنوں سے خوب آگاہ تھی، وہ اس کی قدر کرتی تھی۔ وہ اس کی تھی اور نصرو؟ نصرو اس کے بے پایاں غرور اور تمکنت کو سنبھالا دینے والا، اس کی آرزوؤں میں کھنکنے والا جوان تھا۔ اس نے ایک خانے میں عقل، تجربے اور حاضر دماغی کو جگہ دی، دوسرے میں بھرپور بدن کو۔ وہ اپنے وقت کی دردیدی تھی۔ اگر دردیدی تو کو اپنے دل و دماغ اور بدن میں رکھ سکتی تھی تو وہ دو کو بھی سنبھالنے کی مجاز نہ تھی۔ اس نے اپنی زندگی کی تکمیل اور روز و شب کی سرگرمیوں کے لیے دو کو ضروری سمجھا اور اب تیسرا بھی آ دھمکا، بالکل معصوم صورت کا پیارا پیارا بھولا

بھالا لڑکا ۔ یہ جمیلہ کا لڑکا بوبی تھا ۔ بالکل باپ پر گیا تھا ۔ ہلکی ہلکی مسکراہٹ لیے چپ چاپ کمرے میں داخل ہوا ۔ نیتی بیرنی سنگھار میز پر بیٹھی بال سنوار رہی تھی ۔ اس نے اسے آئینے میں سے دیکھا تو قریب آنے کو کہا ۔ بولی ! " ذرا پیچھے سے چولی کا بند تو کھول دے ۔ "

بوبی جھینپا ۔ آگے تو بڑھا لیکن قدم بھر پیچھے ہی رہا ۔ وہ ترش رو ہو کر بولی
" رنڈی کے ! دم گھُٹ رہا ہے ، جلدی کھول ! "
رنڈی کا آگے بڑھا اور اس نے بند کھول دیا ۔
" کیسے آیا ہے رے بوبی ؟ "
" امی ، امی کی مشین ٹوٹ گئی ہے ۔ سلائی کے لئے ڈھیر سارے کپڑے آئے ہیں ۔ مشین ٹھیک کروانے کو پیسے نہیں ۔ "
" پھر میں کیا کروں کنجر ؟ "
کنجر چپ رہا ۔ نیتی بیرنی نے کنگھی رکھی اور ہاتھ منہ دھونے چلی گئی ۔ کنجر ایک طرف کرسی پر بیٹھ گیا ۔

نیتی بیرنی نے ہاتھ منہ دھو کر بدن سجایا ۔ چولی بدلی ——— پھر اس نے ساڑھی بدلی ۔ تیار ہو کر بولی ، " چل پُتّرا ۔ "
وہ رات گئے تک جمیلہ کے گھر میں رہی ۔ لوٹی تو نصرو کمرے کے باہر ٹہل رہا تھا ۔ مارے غصّے کے بیکل تھا ۔ وہ نصرو کو دیکھتے ہی مسکرائی ۔ نصرو نے اس مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے نہیں دیا ۔ پھر جب اس نے کنجی تھمائی تو نصرو نے خاموشی سے قفل کھول دیا ۔ وہ تو کپڑے بدلنے لگی اور نصرو چپ

چاپ بیٹھ گیا۔ اب تو اسے نصرت کی سنجیدگی کھٹکی۔ بولی، "تو چپ چپ کیوں ہے
نصرت؟"

"گیارہ بجے میں میری گھڑی میں اتنی دیر کہاں رہی؟"

"ہونہہ، تو بھی بس وہمی ہی نکلا۔ جمیلہ کے گھر گئی تھی۔ آپ بھی بیمار ہے۔
اس کی مشین بھی بیمار ہے۔ دونوں کو ٹھیک کروایا ہے میں نے۔"

"لیکن جمیلہ سے تیرا کیا واسطہ نینتی؟"

نینتی بیرنی برہم ہوئی اور قدرے جلال میں آکر بولی، "اگر میرا واسطہ نہ ہوتا
تو وہ چار دن میں مر جاتے۔ اس کنجر نے تو اسے چھوڑ ہی دیا ہے۔ اب وہ
بال بچوں کو کیسے پالے؟ میں خرچ نہ دوں تو اور کون خرچ دے؟ کون ہے
اس کا اس دنیا میں؟"

اس کے جلال میں صداقت تھی، سچ کی آگ تھی۔ وہ پھر بولی، "لوگ جانتے
ہی نہیں۔ کنجری کنجری بھی ہوتی ہے اور عورت بھی"

نصرت کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ جمیلہ کو مرنا نہ چاہیئے۔ اسے بھی اس دنیا میں
زندہ رہنے اور بال بچوں کو پالنے کا حق حاصل ہے اور یہ کارِ خیر نینتی بیرنی کے
ذریعے ہو تو کیا مضائقہ ہے؟

رات سورگ میں گزری۔

⁂

کلی پھوٹی، صبح کھلی، زمین جگمگائی۔ ایک دنیا بیدار ہوئی لیکن تکیہ نیک سائیں
کے بھنگی چرسی ہوش میں نہ آئے۔ دراصل انہیں رات بھر سوتے جاگنے کا

دورہ پڑتا رہتا۔ فجر کے وقت ذرا ٹیں ہو جاتے۔ نیتی پیرنی بھی کمرے میں بے سدھ پڑی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ بچھونے کے سلوٹ وہ ساری کروٹیں گنوا رہے تھے جو رات بھر بدن نے لیں۔ خاکدان میں سگرٹوں کے بجھے ہوئے ٹکڑے پڑے تھے۔ گلاس میں تھوڑی سی شراب رہ گئی تھی۔ جاپانی جوتی پلنگ تلے دھری تھی اور جوتی والا باہر تکیے میں پیڑ تلے ڈنٹر پیل رہا تھا۔ اس نے خیرے جھرنی والے کو بھگل گیا تھا اور پھر کیوں نہ بھگل کرتا؟ وہ خیرے جھرنی والے کی طرح عورتوں کی کمائی تو نہ کھاتا تھا۔ وہ تو عورت کا یار تھا۔

موتی شاہ کمرے میں داخل ہوا تو پہلے اس کی نظر نیتی پیرنی کے بدن پر پڑی جو منی اسکرٹ پہننے والیوں کو مات کر رہا تھا۔ پھر اس کی نظر شراب والے گلاس پر پڑی۔ اس نے دو گھونٹ میں گلاس کی شراب تمام کی اور پھر کمرے کے ماحول کا جائزہ لیا۔ چمکیلی بھڑکیلی جاپانی جوتی نیک سائیں کا منہ چڑا رہی تھی جو اس وقت یہاں نہ تھا لیکن موتی شاہ تو جاپانی جوتی سے بھی زیادہ تشویش ناک خبر لایا تھا۔ اس نے نیتی پیرنی کے شانے ہلائے اور کہا، "بی بی!"

بی بی نے "دفع ہو" کہا اور دوبارہ نیند میں کھو جانا چاہا لیکن موتی شاہ کے پاس اس کی نیند سے کہیں زیادہ توجہ طلب خبر تھی اس نے پھر شانہ جھنجھوڑا اور چلا کر کہا، "نیک سائیں پکڑا گیا ہے بی بی!"

موتی شاہ نے شانہ ہی جھنجھوڑا تھا۔ خبر نے اس کا دماغ جھنجھوڑ دیا۔ ہوش میں آئی تو موتی شاہ پھر بولا۔ "نیک سائیں، نیک سائیں پکڑا گیا ہے۔"

"نیک سائیں پکڑا گیا ہے؟ کیسے؟ کہاں؟"

" اٹک کے پل پر ہی دھر لیا گیا - چرس اور افیون سے بوری بھری ہوئی تھی"

" وہ نو کا ناٹ تھا ، خرانٹ تھا ، اتنا سیانا تھا - بوری پھینک دیتا دریا میں ، روپیہ دے دیتا ، معافی مانگ لیتا "

' بی بی ! قسمت اُلٹ جائے ، بھاگ کھوٹا ہو جائے تو بڑے سے بڑا کانٹا ، بڑے سے بڑا خرانٹ ، بڑے سے بڑا سیانا منہ کے بل آگرتا ہے "

نیتی بیری کی کے ہاتھ میں سگریٹ سلگتا رہا - انگلیاں جلنے لگیں تو اس نے سگریٹ پھینکا -

' بی بی ! وہ کہتا تھا اب کے اتنا مال ہاتھ لگے گا کہ تیرے لیے کوٹھی بنوا دے گا "

بی بی اور بھی غمگین ہو گئی - کوٹھی کا نام سنتے ہی اسے نیک سائیں کا غم لگ گیا -

" کتنا اچھا تھا وہ ، کتنا خیال تھا اسے میرا ! "

مونی شاہ نے یہ جملہ سنا اور اپنی آنکھوں کے سامنے جوانی جرتی کو چمکتے بھی دیکھا - اس نے زیرِ لب کہا ، " رنڈی " ، اور رنڈی تک یہ حرف شیریں نہ پہنچا - وہ دلدوز انداز میں بولی ، " پھر اب کیا ہو گا ؟ "

" مقدمہ چلے گا "

' اس کے لیے تو پیسہ چاہیئے "

" ہاں ، پیسہ چاہیئے - پیروی یونہی تو نہ ہو گی "

وہ سر پکڑ کے بیٹھ گئی - تھوڑا بہت پیسہ اس کے پاس تھا - لیکن مقدمے میں تو پیسہ پانی کی طرح بہانا پڑے گا - نیک سائیں ایسا واردانیا روز روز تو پیدا نہیں ہوتا - لاکھوں میں ایک ہوتا ہے مائی کا لال - اس نے نیتی بیری کے سارے

حق حقوق پورے کئے اور اب گویا انہیں ادا کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ لیکن پیسہ چاہیئے تھا ـــــ مقدمے کے لیے، اس کے لئے، جمیلہ اور جمیلہ کے بچوں کے لئے، نصرو کے سکوٹر کے لیے اور پیسہ دینے والا اندر تھا۔ دو سہاروں میں سے ایک سہارا ٹوٹا تو وہ مضطرب ہوئی۔ اس کا دل بجھ گیا۔ بتیس دانتوں میں سے نکلنے والی ہر بات پوری کرنے والے کو وہ کیسے بھول جاتی؛ اس نے تو عقل و ہنر کی بدولت تکیئے کو اوّل درجے کا کاروباری مرکز بنا دیا اور اس کا نظم و نسق نہایت خوش اسلوبی سے چلایا۔ کس دھوم سے قوالی کی محفلیں جمتیں۔ کس باقاعدگی سے جوا ہوتا۔ بھنگ گھٹتی چرس پی جاتی اور اندر جاتے ہر قسم کی نشہ آور چیزیں پرچون اور تھوک کے بھاؤ بک جائیں۔

دن بھر وہ مقدمے کا، اپنا، جمیلہ کا، جمیلہ کے بچوں کا، نصرو کے سکوٹر کا خیال کرتی رہی۔ اس نے سگرٹ پر سگرٹ پھونکے، کمرے میں دھواں بھر گیا۔ اسے ٹبی کا خیال آیا لیکن اب وہاں کیا دھرا تھا۔ وہاں تو دل ڈوب رہے تھے، امیدیں بھٹک رہی تھیں۔ ٹبی اجڑ رہی تھی۔ ٹبی اب کسی کی آس پوری نہ کر سکتی تھی۔

نصرو آیا تو وہ ٹکٹکی باندھے چھت سے آویزاں فانوس دیکھ رہی تھی جس میں ننھے ننھے رنگ برنگی قمقمے گندھے تھے جلتے تو روشنی کے پھول کھل جاتے۔ کیسے کیسے پھول کھلائے ننھے پھول سائیں نے! پھر جب ٹیوبیں جلیں تو رات میں دن طلوع ہو جاتا۔

نیتی پیرنی کو محویت کے عالم میں دیکھ کر نصرو دروازے پر ہی رک گیا اور جب دیر تک اس کی توجہ اپنی جانب نہ کھینچ سکا تو کھانسا۔ نیتی پیرنی نے بے پروائی سے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر پہلے ہی نقطے پر نظریں لے آئی۔

"بیٹھ جا نصرو۔"

اس آواز میں گرم جوشی کی بجائے دُرمندی تھی، دھیماپن تھا۔ نصرو بیٹھ گیا اور بولا۔ "تجھے آج کیا ہو گیا ہے، بی بی!"

"نیک سائیں پکڑا گیا ہے۔"

"اچھا۔"

"ہاں۔"

پھر "ہوں" کہہ کر چُپ ہو گیا۔ دل میں خوش تھا کہ اب نیک سائیں کی جنت اسی کی ہو رہے گی لیکن آج جنت افسردہ تھی۔ اُس نے دل جوئی کے لیے کہا، "بُرا ہوا بی بی! پر تو غم نہ کر!"

"کوئی اپنے آپ بھی غم کرتا ہے؟ غم تو آپ ہی اندر سے پھوٹ پڑتا ہے۔"

"چل دریا کی سیر کر آئیں، جی ہلکا ہو جائے گا۔"

"نہیں اڑیا! آج سیر کو جی نہیں چاہتا۔"

"جیسے تیری مرضی۔"

نصرو چُپ چاپ بیٹھا رہا۔ وہ بولی، "نصرو! تو تانگہ گھوڑا خرید لے!"

"کیوں سکوٹر نہیں لینا؟"

"جس کے بھروسے پر سکوٹر لینا تھا وہ تو اندر ہو گیا۔ میرا تو خرچ ہی اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کے سوا دوسرا پورا نہیں کر سکتا۔"

"تھوڑا بہت خرچ تو میں بھی چلا دوں گا لیکن گھوڑے تانگے کا قرض بھی تو اتارنا ہو گا۔"

"مجھ سے یہ خرچ پورا نہیں ہو سکتا، بلّی! نھری کیبل کے سگریٹ پیتی ہوں سے ولایتی پیتی ہوں۔ کبھی دیسی نہیں پی۔ یہ خرچ تو دہی پورا کرتا تھا۔"

"ہوں۔"

رات بھر تدبیریں سوچتی رہی۔ تکیئے کا کاروبار بڑا مشکل تھا۔ پولیس کی زد سے بچنا جواریوں سے نمٹنا، چرس کا اسٹاک چھپا کر رکھنا، اثر ورسوخ سے کام لینا آسان نہ تھا لے دے کے موتی شاہ اور مولا ملنگ رہ گئے تھے نیک سائیں کے جانشین لیکن تکیئے کا نظام سنبھالنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ وقت آن پڑا تھا اور اسے خود ہی کچھ کرنا تھا۔

نصرو نے گھوڑا تانگہ لے لیا۔ چاچا نے مشکی دے دی۔ مشکی بھی ایسی جیسے پری پورے اڈے پر سب سے الگ نظر آتی اور دوڑنے میں بجلی تھی۔ ہنہناتی تو گردن تن جاتی اور لانبی لانبی ایال ہوا میں لہراتی۔ پھر تانگہ؛ وہ تو قوس قزح تھا۔ سانول رنگ اس پر اتار دیئے تھے کاریگر نے۔ نہایت نفاست پسند اور شوقین مزاج اس پر بیٹھتے معمولی گاہک سے تو نصرو سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ جو بھی آتا سالم تانگہ کرتا۔

ایک دن مینہ پڑا اور آسمان پر قوسِ قزح نکھری۔ رنگوں کی موجیں اس میں آکر ٹھہر گئیں۔ ایک گوشے میں چاند زرد ہو گیا تھا۔ بادلوں کے جزیرے جگہ جگہ ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ مینہ پڑا تو ہوا میں خنکی آگئی۔ نصرو کے عین سامنے قوسِ قزح کا پل کھڑا تھا۔ طبیعت مچلی، جی میں آئی پل کر بلی بی کو لائے اور قوسِ قزح پر نکل آئے۔ ہاں سات روپے کم کمائے تو کیا ہوا؟ ابھی خیال کی گردش تھمی نہیں تھی اور وہ باگیں تھام کر مشکی کو اسٹارٹ کرنے ہی کو تھا کہ پیچھے سے ایک لڑکے

کی آواز آئی ، "تانگہ !" یہ آواز بُوبی کی تھی ۔ اور کسی کی آواز ہوتی تو وہ کان کی بھی نہ دھرتا لیکن بُوبی کی آواز پر کیسے سُنی ان سُنی کرتا ! اس نے ایڑ لگائی ۔ دو اور تانگے آواز کے کوندے پر لپکے ۔ نصرو کی مشکی ذرا تِھرکرآئی اور اگلی ٹانگوں پر ناچنے لگی لبھو اور لبو ٹی کے تانگے بھی بلا کے خوبصورت تھے ۔ ان کے گھوڑے بھی بڑے بانکے تھے ۔ لیکن نصرو کی مُشکی کے چمکتے ہوئے ریشمی پنڈے کی شان ہی اور تھی شاہی دروازے کے باہر والے دوراہے پر جگمگاتے جھلملاتے ہوئے تینوں تانگے آ کھڑے ہوئے جن کے جانور بڑے بے کل تھے ۔ سواری بڑے نخرے سے برآمد ہوئی ۔ بوبی کے ہمراہ کبوتری رنگ کے نئے برقع میں ایک عورت اندر باغ میں سے شاہی دروازے کی جانب آئی ۔ چال میں پھرتی تھی ۔ برق وار چمک رہا تھا اور یہ تانگے ایسے ہی چمکتے دمکتے ہوئے برقعوں کے لیے مخصوص تھے ۔ انگلیوں میں جڑاؤ انگوٹھیاں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں ۔ عورت نے نقاب اٹھائے بغیر بُوبی کے کان میں کچھ کہا ۔ بُوبی اور عورت تانگے میں بیٹھ گئے ۔ نصرو نے بُوبی کو دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ جمیلہ کس نیت سے تانگے میں بیٹھی ہے ۔ جانتا تھا کہ نیتی پیرنی کے پاس اب اتنا روپیہ نہیں کہ جمیلہ اور جمیلہ کے بچوں کا خرچ بھی پورا کرے ۔ اب تو یہ خرچ خود اسی کو پورا کرنا تھا ۔

عورت نے دونوں نقاب گرا رکھے تھے لیکن ننگے پاؤں کی وہ بار بار نمائش کرتی ۔ نصرو نے جمیلہ کو دیکھا تو نہ تھا لیکن جانتا تھا کہ نیک سائیں بڑا حُسن پرست ہے ۔ اس کا انتخاب ضرور دلآویز ہوگا ۔

لانبی لانبی مرصع انگلیوں نے اشارہ کیا اور نصرو نے مُشکی کا رخ اشارے پر

پھیر دیا - ہوا میں سانٹا لہرایا ، مشکی بجلی ہو گئی ، بڑی سڑک پر نکل آیا تو مشکی رُکتی تھمتی ہوئی دھنک کے متوازی دوڑ رہی تھی - ایک بار مرصع انگلیوں نے اشارہ کیا تو نصرو نے پیچھے کو ذرا گردن موڑی اور اس کی نظر پورے ننگے بازو پر پھسل گئی. اس کی مضبوط انگلیاں مچل گئیں اور وہ چکنے چمکیلے ، نرم ملائم و گداز بازو کو دبانے کے لئے تڑپا - اسے اندازہ ہوا کہ معشوق بے نظیر ہے - جو ہو سو ہو ، نیتی پیرنی سے بے وفائی ہوتی ہو تو ہو ، وہ کون اس کی بیوی تھی ، اس سے کاہے کی وفا ، کاہے کی بے وفائی ، آج وہ موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دے گا - اس نے پھر چابک ہوا میں لہرایا - مشکی اور بھی بھڑکی اور وہ آپ معشوق بینظیر کے حُسن کے خط و خال ترتیب کر کے پھڑک اُٹھا - رگ و پے میں حرارت دوڑ گئی اور لہو میں سنسنی کوندنے لگی - اس نے یالو کا نغمہ چھیڑا :

ہتھ جوڑا اے پکھیاں دا

نالے ساڈا ماہی لگدا

نالے چانن اکھیاں دا

بو بی ایک کر اگلی سیٹ پر جا بیٹھا اور گاہے گاہے دو انگلیاں ہونٹوں میں رکھ کر زور زور سے سیٹیاں بجانے لگا - مشکی بار بار بھڑکتی - نصرو بھی سیٹیاں بجانے لگا اور پھر دونوں ہنسنے لگے - مشکی اب بڑے ہوٹل کی سمت جا رہی تھی - اور نصرو کے چاچا نے کہہ رکھا تھا " بڑے ہوٹل کی سواریاں لینا ، منہ مانگا کرایہ ملے گا ، اور قرض جھٹ پٹ اُتر آئے گا - " لیکن نصرو تو سود و زیاں کی منزل طے کر کے عقل و خرد سے دُور

جنوں و مستی کے سراب میں آگیا تھا، جہاں آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔

پچھلی نشست پر عورت بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی اُس کی زلفیں ہوا میں لہرا جاتیں، جنہیں وہ مرصّع انگلیوں سے سمیٹ لیتی۔ اس پر ایک کار کی روشنی پڑی اور اُس نے نقاب اُلٹ لئے۔ کار کی رفتار سُست پڑ گئی۔ وہ مسکرائی۔ روشن کار اور روشن چہرے میں سمجھوتہ ہو گیا۔ کار رُک گئی۔ مرصّع انگلیوں نے اشارہ کیا۔ تشگی رُک گئی۔ انگلیوں نے بوبی کی چٹکی بھری، بوبی اور مرصّع انگلیاں نیچے اُتر گئیں۔ نصرو نے جنوں و مستی کے سراب سے پلٹنے کی کوشش کی، لیکن اُسے دیر ہو گئی۔ اور عورت کار میں جا بیٹھی۔ بے نقاب عورت نے کار والے کو دس کا نوٹ نکالنے کو کہا۔ سو سو کے نوٹوں میں پانچ پانچ کے دو نوٹ تھے۔ عورت نے نوٹ لے کر بوبی کو دیئے اور نصرو کو تھما آنے کو کہا۔ اب نصرو جنوں و مستی کے سراب سے پلٹ آیا تھا۔ عورت کا جانا پہچانا ہوا تاب دار چہرہ اس پر بجلی بن کر گرا۔ بوبی تانگے میں ایک نوٹ پھینک کر کار میں آ بیٹھا جو شعلہ وار گذر گئی۔ نصرو کا سارا غصّہ اس کے حلق میں سمٹ آیا اور اُس نے چیخ کر کہا:

"گشتی ے!!"

پیشہ

عصمت چغتائی

مجھے معلوم تھا۔ وہ سو ٹکا سو طوائف ہے۔ وہ سرخ مصنوعی بال، چست کپڑے اور دن رات مردوں کے ٹھٹھے۔ ناچ گانے اور موٹے مہین قہقہے۔ مجھے اپنے کمرے میں بیٹھے بٹھائے جھکولا کرتے تھے۔ ہم عورتیں بڑے سے بڑے پہلوانوں کو چت کر سکتی ہیں پر جب طوائف سے ٹکر ہوتی ہے تو ساری نسوانیت اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماں لوری کے ساتھ ساتھ بچے کے دل میں یہ بات چپکا دیتی ہے کہ طوائف اژدھا ہے، سانپ ہے! کیا کچھ ہے!

اور یہی بچپن کی نفرت خون کے ذروں میں ناچ رہی ہے۔ ویسے ہزاروں عورتیں گزر جائیں۔ پتہ نہیں چلتا۔ لیکن طوائف کو سونگھ کر ہرن کی طرح بھڑک جاتی ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ یہ خوشبو میں نے پہلی دفعہ بچپن میں سونگھی تھی۔ بھرائچ میں سید میاں کے مزار پر جمعرات کو طوائفوں کا جمگھٹا ہوتا۔ اللہ کے پیارے بھی اس متبرک دن کچھ زیادہ ہی آجاتے۔ ایک دن ایک پکی سی طوائف نے مجھے نہ جانے کس جذبہ کے تحت گود میں اٹھا لیا۔ وہ اس کے پھسلتے کپڑے اور مخصوص خوشبو میں بسا ہوا سینہ! میں جلدی سے اس کی گود سے نکل آئی۔

اس دن مجھے سب نے خوب تھو تھو کر کے چھیڑا کہ ہے! بچاری کو رنڈی نے چھو لیا اور میں بھی اس ہتک کے احساس سے دیر تک روتی رہی۔ پھر ایک دن میری پھوپھی آئیں اور انہوں نے مجھے پیار کیا تو وہ پھسلتے ہوئے ریشمی کپڑے اور دہکتا ہوا سینہ! نہ جانے کیوں میں فوراً مچل کر بھاگ آئی۔ میرا اندازہ ٹھیک نکلا اور میری رنگین پھوپھی مشکل سے مہینہ بھر رہی ہوں گی کہ دس بچوں کے باپ میرے اباجان اُن پہ بُری طرح عاشق ہو گئے۔ میری اماں بچاری بجھ کر رہ گئیں۔ بھلا پان بیڑی کی دکان کے سامنے کوئی شاندار ہوٹل کھول لے تو بچاری دکان کا جوبن کے دن کا؟ تیرہ ٹو نے ٹوٹکے ہوئے، تب جا کر کہیں ان کے گُردوں میں درد اُٹھا اور وہ بھاگیں۔ ہاں تو میرا مطلب یہ ہے کہ ہم عورتیں طوائفوں کو سونگھ کر ہی کھٹک جاتی ہیں۔ بقول کسے ان کا ٹھسا دیکھ کر ہی حفاظتی دیواریں کھڑی کرنے کو جی چاہتا ہے وہ کوٹھے سے اُتر رہی تھی اور میں چڑھ رہی تھی کہ میں نے انہیں سونگھ لیا۔ اے ہے یہ میں کہاں آ گئی؟ کیا کہے گی دنیا؟ میرے محلے والے کیا کہیں گے؟ ایک سے ایک بدمزاج بھرا پڑا ہے۔ محلہ والیوں سے زیادہ یہ محکمہ والے ایسی ویسی باتوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔

عید کا دن تھا۔ غریبی میں کیسی عید اور کیا محرم۔ کپڑے بھی نہ بدلے لیٹی اخبار دیکھتی رہی۔ پڑوس کے یہاں چار بجے سے برتن کھڑک رہے تھے۔ ان بچاریوں کو نیاز نذر کی بڑی فکر پڑی رہتی۔ بستر پر پڑی ناشتہ کر رہی تھی کہ دروازہ کھٹکھٹایا اور قبل اس کے کہ میں سنبھلوں وہ آن دھمکیں!

عام طور پر کسے معلوم رہتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے اور میری عمر میں یہ پہلا

موقع تھا کہ کوئی طوائف دندناتی چلی آئی ہو۔ لہٰذا میں گھبرا کر رہ گئی۔

"اے ہے میں نے کہا کہیں تم ناشتہ نہ کرچکو ـــــ کیا پشتم پشتم سویاں بگھاری ہیں" وہ اپنے چست کپڑوں میں سے چہکاریں، کمبخت کو یہ بھی سوچنے کی فرصت نہ تھی کہ تنگ کپڑے پہننے کے دن کبھی کے جا چکے تھے اور خمیری آٹے کو تسموں سے کسنے سے نہایت ناہموار سطح ہو جاتی ہے۔

"میں صبح کے وقت مٹھاس نہیں کھاتی" میں نے غرور سے گرہستن بننے کی کوشش کی۔

"اوئی آج عید کے دن بھی مٹھاس نہیں کھاتی۔ بھئی تمہیں ہماری قسم، تھوڑی سی ضرور چکھو" وہ نہایت بے تکلفی سے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

یا اللہ! کیا یہ مجھے بھی طوائف سمجھ کر تبرک کے ذریعے میرے گناہ دھوتے آئی تھیں۔ اب یہ کیسے بتاؤں کہ میں قطعی نیک اور پارسا ہوں۔ اور قسم! اوہ معبود یہ وہی تو اس کے ہزاروں عاشقوں کی چھوڑی ہوئی قسم تھی جو یہ میرے حلق میں ٹھونس رہی تھی! میں جل اٹھی۔ لیکن جب وہ بے حیائی سے مصر ہی ہو گئیں تو میں نے دو چمچے چکھ لیے۔

"باورچی نے کہا کہ یہ بیوی مسلمان ہے۔ بس میرا جی ملنے کو پھڑک رہا تھا.... مگر تم تو سارا دن غائب رہتی ہو" کسی نے انہیں پکارا اور وہ چلی گئیں۔

میں نے دو چمچے اور کھائے۔ یا خدا! جی چاہا حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دوں۔ یہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں طوائف کی کمائی کھا رہی تھی ـــ عصمت فروشی کی جمع کی ہوئی گھناؤنی دولت ـــ فاحشہ بدکار کا پیسہ؟

مگر پھر میرے دل میں نہایت بے شرمی کے باغیانہ خیالات ناچنے لگے۔ یہ رنڈی کا پیشہ بھی تو اپنے باپ دادا ہی کا پیشہ ہے۔ میرے ایک چچا تھے جنہوں نے تین ہفتہ میں تیس ہزار روپیہ رنڈی بازی میں اڑا دیا تھا۔ اس سے مجھے کیا کہ میری چچی رنڈی کون تھی۔ ان لال بالوں والی ہی کی کوئی بہن بھانجی ہوگی۔ میں نے اور شوق سے سویاں کھانی شروع کیں۔ جیسے میں پھینکا ہوا مال سمیٹ رہی تھی۔ مجھے ایک قسم کا اطمینان مل رہا تھا۔ میں ایک امیر کو کچھ تھوڑا سا غریب بنا رہی تھی۔ ایک چمچہ اور لیا اور میرا منہ کیوڑہ اور میوہ میں گھلی ہوئی سویوں سے بھر گیا۔ ایک بڑا سا سالم پستہ میری داڑھ کے نیچے کچ سے آگیا۔ چکنائی کی ننھی بوندیں منہ میں پھدکنے لگیں جیسے میں نے کسی موٹے سے بنئے کو چبا ڈالا۔ مگر فوراً ہی مجھے اس کی چربی کے خیال سے ابکائی آگئی۔ مجھے وہی اطمینان محسوس ہو رہا تھا جو انگریزی کپڑے جلاتے وقت بلوائیوں کو ہوتا ہے۔ ہماری انتقام پسند آنکھیں ان خالی خولی کپڑوں میں اپنی مرضی کے موافق تخیلی جسم دیکھ کر سکون محسوس کرتی ہیں۔

میں نے سرہانے کی میز سے میٹرک کے امتحان کی کاپیاں اٹھا کر دیکھنا شروع کیں۔ کیسی عید اور کیسی بقرعید۔ ابھی تین سو کاپیاں اور دیکھنا تھیں مگر میرا دماغ جب بھٹکنا شروع کر دیتا ہے تو ہزاروں گھیروں پکڑ میں نہیں آتا۔ جل کر میں نے کئی بدقسمتوں کو فیل کر دیا۔ پھر کاپیاں دور پھینک کر انگڑائیاں لینے لگی۔ یہ یہاں کی آب و ہوا بھی کیا عجیب ہے جیسے بڑے سے گیلے تولیے میں فضا لپٹی اونگھ رہی ہے تھکی تھکی نیند، اعضا بھاری، اور پھیلنے جیسے کسی نے سریش لگا کر ہلکا سا سکھا دیا ہو۔ ایک جھلایا ہوا سرور سا ـــــــ اور پھر پڑوسن کے یہاں سے قہقہوں کے
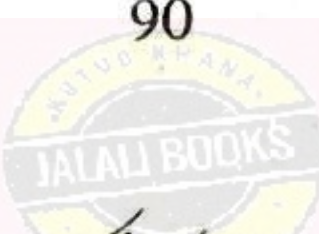
گرم گرم بھبکے!

بد نصیب! مجھے پڑوسن پر رحم آنے لگا۔ ممکن ہے غریب اپنا جوہر عصمت لٹانے پر مجبور ہو گئی ہو۔ شاید کسی ظالم نے اس کی عزت لوٹ لی ہو اور پھر وہ کھسیاکر سر بازار بکھیرنے لگی اور مجھے اس پر پیار آگیا۔ جب کبھی ہم سب بچے اماں سے کوئی کھانے پینے کی چیز جھپٹنے لگتے تو وہ بھی کھسیاکر ٹوکرے کا ٹوکرا پٹخ دیتی تھیں کہ "لو نامردو بھکسو ــ آپ مروگے۔!"

لیکن ہمیشہ نیک خیال کے ساتھ بدخیال ضرور میرے دماغ میں رینگ آیا کرتا ہے اور جونہی بچارہ نیک خیال اونگھا بد نے پھن اٹھایا۔ "یقیناً یہ سرخ بالوں والی طوائف تو جان بوجھ کر شوقیہ کسبی ہو گی۔ سستی کے مارے اور دنیا کا کچھ کام نہ ہو سکا۔ مزے سے یہ پیشہ اختیار کر لیا۔ ہاں اور کیا؟ بھلا پڑوسن سے کیا سلائی ہوتی یا چکی پستی۔ سو جھمیلے ہیں دنیا کے اور پیشوں میں۔ میاں بیوی، بچے، ساس، نند کی نندئیں بھلا کون بھگتے ــــ بھلا یہ جوبن قائم رہتا جو پڑوسن کے بھی دو چار ساس نندیں ہوتیں ــ توبہ کیجئے۔!

ایک دن جیسے ہی فلیٹ پر پہنچی۔ پڑوسن کے یہاں کسی کے چیخنے چلانے کی آواز آئی۔ سارے دن کی تھکن اس پر گھڑی بھر کو چین نہیں۔ سکول سے آ کر جب تک کئی گھنٹے مردے کی طرح نہ پڑے رہو۔ تھکن نہیں اترتی۔ معلوم ہوتا ہے کلاس میں لڑکیوں نے بھیجے کو گنے کی گنڈیری کی طرح مزے لے لے کر چبایا اور تھوک دیا۔ بڑی مشکلوں سے اس چوسی ہوئی گنڈیر کو تازہ کیجئے۔ صبح پھر نوکیلے دانتوں کے گھسے! سال میں ۲۶۰ دن یہی عمل جاری رکھیے۔ اس کے بعد

اس کے بعد پھر وہی چوسی ہوئی گنڈیری کے پھوک -

دروازہ کھلا اور وہ ایڑیاں ٹھمکاتی چلی آئیں - آتے ہی گرجیں -

"میں تو عاجز آگئی ہوں نگار سے - اللہ جانتا ہے، ایسی بھی کیا سکول کی پڑھائی کہ ناس لگ گیا"

اوہو! تو گویا رنڈیوں کی لڑکیوں کے بھی ناس اس قدر ذی ہوش ہوتے ہیں کہ مرسکیں خوب تو آپ بھی چلیں اعتراض کرنے!

"تو کیوں بھیجتی ہیں سکول —— اٹھا لیجیے"

"اُدئی اٹھالوں؟ - لو اور سنو - اے بی آج کل بے پڑھی لکھی کو کون پوچھتا ہے - آج کل تو بس گٹ پٹ کرتی میم چاہیئے"

یہ مجھے آج معلوم ہوا کہ اس پیشے میں بھی تعلیم یافتہ ہونے کی ضرورت ہے شیکسپیر اور ورڈس ورتھ کے حوالوں کی بھی ضرورتیں آتی ہیں -

"کیا بات ہوئی"

"اے وہ میں نے کہا - بیٹی نگار، آج کھڑا پاجامہ پہن - کہ نہیں - جرأت ہے نہیں - بس وہ موٹی فراکیں چڑھا لو - میں نے کہا، تم سمجھاؤ تو شاید مان جائے بات یہ ہے کہ کچھ لوگ دہلی سے آرہے ہیں" انہوں نے رازدارانہ انداز میں کہا اور میرا جی چاہا ان کا چقندر ایسا منہ کھسوٹ لوں، جی؟ یعنی میں سمجھاؤں! خوب تو گویا مجھے بی۔ٹی میں رنڈیوں کی لڑکیوں کو پیشہ کرانے کے ہتھکنڈے ہی سکھائے گئے تھے - اب بھلا بتایئے کہ یہ کیسے سکھاؤں کہ بھئی دلی والوں کے لئے پاجامہ پہنو، کلکتہ والوں کے لئے ساڑھی اور لاہور والے شلوار پسند کرتے ہیں - خوب!

اور دوسرے مجھے یہ نگار مالنی سر سے بُری لگتی تھی ۔ یعنی یہ کیا ۔ یہ ہندو مسلم اتحاد یا فساد کا نمونہ ہے یا کیا؟ بڑے بڑے لیڈر چت ہو گئے اور یہاں ایک محترمہ کی جدت پسندی نے ہندو مسلم سب کو گڈمڈ کر کے رکھ دیا ۔ مگر میری عادت ہے کہ میں ہمیشہ ہر شخص کو مجبور سمجھ لیتی ہوں ۔ شاید یہ لال بالوں والی سیٹھانی بھی مجبور ہی ہو گئی ہو ۔ گڑبڑ میں یاد نہ رہا ہو اور بجائے کسی کی حق تلفی کرنے کے انہوں نے دونوں ہی کا خیال رکھا ۔ خیر!

"تم کبھی ہماری طرف نہیں آتیں" انہوں نے ڈھٹائی سے کہا ۔ قبل اس کے کہ میں روکھا سا جواب دوں بولیں ۔ "نگار نے نئے توڑے سیکھے ہیں"

اگر مجھے کسی وقت پیار آتا ہے تو اس وقت جبکہ وہ ناچ رہی ہو ۔ اس وقت وہ مجھے عین بین اس محنتی مزدور کی طرح معلوم ہوتی ہے جو پیٹ کی خاطر سرمایہ داری کے کولہو میں بیل کی طرح جتا ہوا ہو یا جیسے کوئی گرہستن چکی پیس رہی ہو ۔ رقص کرنا مذاق نہیں ۔ بوٹی بوٹی ہل جاتی ہے جیسے دس سیر اناج پیس لیا ہو ۔ مگر مجھے طوائف کی زندگی کے دوسرے رخ سے نفرت اس لئے نہیں کہ وہ کچھ مختلف ہے ۔ بالکل نہیں ۔ بلکہ ۔ یا کچھ مزدورت سے مشکل ہے ۔ یہ بات نہیں ۔ بلکہ یونہی ۔

دوسرے دن ہمت کر کے میں سیٹھانی کے فلیٹ میں چلی گئی کہ دیکھوں اندر سے ان لوگوں کے گھر کیسے ہوتے ہیں ۔ اُفوہ ۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ کسی چھوٹے موٹے راجہ یا نواب کا گھر ۔ قدِ آدم تصویریں ، برہنہ عورتوں کے مجسمے ۔ یہ طوائفیں ننگی عورتوں کی تصویریں بھلا کیوں اپنے گھر میں رکھتی ہیں ۔ بھلا اس سے کیا فائدہ

سیٹھانی تو شاید اپنے جسم کی بھیانک سلوٹوں کو ان سڈول جسموں کی آڑ میں سے دکھانا چاہتی ہے ۔ ہو گا کوئی گرو ان لوگوں کا ۔

نگار مجھے دیکھ کر ایسے شرمائی گویا ابھی انڈا کھٹک کر باہر نکلی ہے اور بڑی دیر تک نخرے کرنے کے بعد آئی ۔ سیٹھانی نے ڈانٹا تو خیر ریکارڈ لگا کر ناچنے لگی ۔

یہ رنڈیاں ! اُف مَیں نے تو سُنا تھا کہ ان کے جسموں کو گھن لگ جاتا ہے مگر سیٹھانی تو لوہے کی لاٹھ رکھتی تھی اور اولاد تو خدا کی پناہ ۔ کیا پھرتیلا لوچدار جسم، جیسے ناگن انگڑائیاں لے رہی ہے ۔ جب کلائی پر کلائی کی گرہ باندھ کر وہ پنجوں سے توڑے لیتی تو اس کی ننھی ننھی ٹھوکروں سے ساری دنیا ہلکورے لینے لگتی میرا دل لرز اُٹھا ۔ اُف یہ ناگن نہ جانے کتنوں کو ڈسے گی ۔ نہ جانے کتنے شکار تھیلے میں ٹھونسے گی ۔ ویسے تو عورت دوسری عورت سے وقت بے وقت جل ہی جاتی ہے مگر طوائف سے تو خدا کی پناہ ۔ عورت تو اپنا حصّہ یعنی ایک مرد لے کر بازار سے ہٹ جاتی ہے ۔ مگر طوائف سے تو چھٹکارا نہیں جیسے دکان سے اناج لیتے وقت عوام تو حسبِ ضرورت لے کر ہٹ جاتے ہیں مگر خاص لوگ بھر بھر بورے تہ خانوں کے کھیجے میں اتار دیتے ہیں ۔ نتیجہ ؟ ـــ اگر اکنامکس پڑھی ہے تو سمجھ لیجئے اناج کی کمی ۔ تو یہ ہماری جنگ جو طوائفوں سے چلی آ رہی ہے ۔ یہ بھی مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ ہے ۔ دکھ جھیلیں بی فاختہ اور کوّے میوہ کھائیں... کہتے ہیں ایک دن ایسا دکھتا ہوا آئے گا کہ سارے مزدور سرمایہ داروں کو پیس کر رکھ دیں گے ۔ اور ان کا سارا سرمایہ چھین لیں گے ۔ شاید عورتیں بھی اسی طرح حملہ

کر کے طوائفوں کا سرمایہ چھین لیں ۔ شاید!

شام ہوئی تو گاہک آنے لگے ۔ مارے شرم کے میں سکڑی ایک طرف کو بیٹھی رہی کہ موقع ملے تو آڑوں کریں ۔ یہ مجھے بھی ان میں ایک نہ سمجھ لیں اور یہی ہوا کہ ایک بجھے ہوئے سے ایڈیٹر صاحب انہوں نے میرے سر چپکا دیے ۔ کمبخت میں کچھ بول بھی نہ سکی اور اس نے میرا سودا بھی کر دیا۔

تھوڑی سی دیر میں پورا ہال بھر گیا ۔ رنگین عورتیں اور عیاش مرد ۔ زور کے قہقہے چلنے لگے ۔ ایک کونے میں چار چھ نے بیٹھ کر پینا اور جوا شروع کر دیا۔ دوسری طرف نگار گھیرے میں ادھر سے اُدھر چمک رہی تھی ۔ اس پر لوگوں کی خاص توجہ تھی ایک ادھیڑ سا مرد تو اسے گود میں گھسیٹے لیتا تھا اور وہ ہنس ہنس کر انہیں مار رہی تھی ۔

مگر سماں تو سیٹھانی نے باندھ رکھا تھا ۔ گہرے رنگ کے بھڑک دار کپڑے جو دن کو بے تکے لگ رہے تھے اس وقت بہار دے رہے تھے ۔ پاؤڈر سرخی سے لیس جیسے چوتھی کی دلہن دو چار کمسن لڑکوں میں گھری ہوئی نازک نازک چہلیں کر رہی تھی ۔ اس وقت بلا کی کمسن اور حسین معلوم ہو رہی تھی ۔ میں متحیر تھی کہ جوانی عمر سے ہوتی ہے یا اداؤں سے ۔ اور ادھر وہ ایڈیٹر صاحب بیٹھے چبا رہے تھے انتہائی نفاست پسندانہ باتیں اور اس خوبصورتی سے کہ میں ہکلا ہکلا کے رہ جاؤں۔ ان کی پوری توجہ ان برہنہ تصویروں کی طرف تھی جو میرے بہت ہی قریب ٹنگی تھیں بلکہ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے ہی جسم پر چپکی ہوئی ہیں ۔ بار بار وہ انگلیوں سے ایسی تصویروں کے خطوط چھو کر ان کے حسن و قبح پر بحث کر رہے تھے

جس کے جواب میں گھبرا کر مجھے اپنے بٹوے میں کوئی نہایت ہی ضروری چیز ڈھونڈنا پڑتی تھی ۔ نگما پھر اکر وہ عورتوں کے سینوں کے آدق مسئلہ پر لے آتے تھے اور آنکھوں میں میٹھی میٹھی نمی پیدا کر کے اپنے سوکھے ہاتھوں سے سانچے ڈھال ڈھال تشریح کر رہے تھے ۔ باوجود مجھے اس قدر ڈھیٹ ہونے کے کئی دفعہ قالین کے نقش و نگار گھورنے پڑے ۔ ہر جنبش پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے جسم کو آٹے کی طرح خوب پیروں سے گوندھ کر بھیانک سا پتلا بناتے ہیں ۔ پھر بگاڑ دیتے ہیں انہیں مجھے اس طرح نچوڑتے میں کچھ مزا آرہا تھا ۔ کیونکہ وہ برابر مسکرا رہے تھے ۔ جل کر کئی دفعہ جی میں آیا کہ ان کے بھی کسی حصۂ جسم کا ایسا مذاق اڑاؤں کہ ایک دفعہ تو غلیظ مسکراہٹ سے بھری آنکھ بھی جھینپ جائے مگر تہذیب نے زبان پکڑ لی ۔

موقع پاکر میں لپکی اپنے کمرے کی طرف ۔ گیلری میں ایک فوجی نوجوان نگار کو بُری طرح جھنجوڑ رہا تھا اور وہ اُوں اُوں کر کے اُسے گھسوٹ رہی تھی ۔

پلنگ پر لیٹ کر نہ تو نیند ہی آئی اور نہ ہی کچھ کام ہو سکا ۔ دوسرے دن انسپکٹرس آنے والی تھی ۔ مجھے اس کو رجھانے کے لئے سو سو بناؤ کرنا تھے ۔ سبق مؤثر ہو ۔ اندازِ گفتگو مرعوب کن ، لباس مدبرانہ اور چال ڈھال میں نرمی آمیز دبدبہ ——— جماعت کی توجہ ، بورڈ کا استعمال ——— سوال وجواب کی اہمیت ——— میرے معزز پیشے کے شریفانہ گر ! لیٹے لیٹے میں یونہی ورزش کرنے لگی ۔ پھر ایک دم مجھے خیال آیا جو کوئی مجھے اس طرح دیکھ لے تو ۔ کسی کی موجودگی کے خیال سے مجھے ایک دم تنہائی کا شدید احساس ہونے لگا ۔ میں کتنی اکیلی ہوں ۔ سوائے ان قہقہوں کے جو مہیب چٹانوں کی طرح سیٹھانی کے فلیٹ سے لڑھک لڑھک کر میرے دماغ سے

ٹمکا رہے تھے ۔ گھنگھروؤں کی جھنکار اور تالیوں کی آوازیں ایک بارگی میرے جسم میں رینگ کر ہزاروں نبضوں کی طرح پھڑپھڑانے لگیں اور پھر بدی نے دماغ میں کروٹیں لینا شروع کیں ۔

اگر ان کروٹوں کا ایک رُخ بھی کسی کو دکھائی دے جائے تو ۔ تو نہ جانے کیا ہو مَیں اسی خوف سے لرزا کرتی ہو ۔ مثلاً یہی کہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے سیٹھانی بن سنور کر پیٹ کی خاطر اپنے گاہکوں کو لبھاتی ہیں ۔ مَیں بھی کیل کانٹے سے درست ہو کر اپنے گاہکوں کے دربار میں جاتی ہوں ۔ فرق اتنا ہے کہ میری عقل ۔ وہی چوسی ہوئی گنڈیری ۔ اور سیٹھانی ۔ یعنی مکمل رس کا گھڑا ۔ میں دماغ بیچتی ہوں اور سیٹھانی جسم ! اور میرے دماغ کا مول سیکنڈ ہینڈ ٹائر کے برابر یعنی ستر روپیہ ۔ اور سیٹھانی اپنی ایک انگڑائی میں اتنا کما لیتی ہے کہ میرے ابا حکومتِ برطانیہ کے اعلیٰ افسر ہونے کے باوجود ساری عمر میں نہ کما سکے ۔ ہم دونوں ہی بازار میں اپنے اپنے خوانچے لگائے بیٹھی ہیں ۔ مال مختلف مگر مقصد وہی ۔ میرے مرجھائے ہوئے دماغ کی حیثیت ان کے دسیع جسم کے آگے ایسی ہی ہے جیسے پان بیڑی کی دکان کے آگے کرکٹ کلب ۔ یقیناً میرا سودا بُرا رہا ۔ اور مَیں جلنے لگی ۔ اپنے تخیل سے بھڑکائی ہوئی آگ میں ۔ لوگوں کو طوائفوں پر رحم آتا ہے ۔ ان کے سدھار کی فکریں ہیں ۔ یہ نہیں کہ وہ تائب ہو جائیں ۔ نہیں بلکہ جو بڑی گت سے ہیں ان کے دن پھر جائیں ۔ ان کے میلے کپڑے زرق برق ہو جائیں ۔ سڑے بسے گندی نالیوں کے پاس جو مکان ہیں وہ "میرین ڈرائیو" پر پہنچ جائیں ۔ گاہک آئیں مگر نہ اتنے کہ ان کا جی میلا ہو جائے اور یہاں تنخواہ کا گریڈ ہر سال گر جائے ۔ کچھ پرواہ نہیں

طالب علموں یا دوسرے لفظوں میں دوزخ کے دو دو فاؤں کی تعداد دگنی ہو جائے

ہیڈ معلمہ چوس ڈالے ۔ دفتر کے کلرک بھنبوڑ ڈالیں ۔ کمیٹی کے ممبر ڈکار جائیں۔ کچھ

پرواہ نہیں ۔ استانیاں بچوں کے دماغ بنا رہی ہیں اور طوائفیں لاوارثوں کے

کے دل کی ٹھنڈک ۔ دونوں ہی اپنا اپنا کام کر رہی ہیں ــ پھر ۔ پھر یہ کیوں ؟

جب رات اتنی دماغ کشتی لڑی ہو تو انسپکٹرس کے سامنے کیا ناز و ادا

چلیں ۔ نتیجہ یہ کہ اس سال جو مستقل ہونے کی امیدیں تھیں رخصت ، جو مسلسل روح

فرسائی کا ارمان تھا ختم ! اُف جس نے اپنی زندگی ہی قوم پر قربان ہونے کے

لئے وقف کر دی ہو .... وہ .... گر قوم ان ادھ مری گائیوں سے

گھن کھا چکی ہے ۔ یہ بیمار بکریاں ۔ ان سے قوم کو گھن آتی ہے ۔

دوسرے دن سیٹھانی پھر آن پہنچی اور مجھے ایسے نصیحت کرنے لگیں کہ کوئی میں

بھی ان کی پڑوسن کی ہوں اور اندھا دھند زندگی گزار رہی ہوں ۔

" اے ہے بس ہر وقت پڑھنا ۔ اللہ مارا دماغ بھی ہل جاتا ہے "

میں منمنا کر چپ ہو رہی ۔

" دیکھو تو کیا شکل نکل آئی ہے " انہوں نے رحم کھانا شروع کیا اور میرے دل

میں بغاوت کا بھوت ناچا ۔ یہ مجھے کیوں چھیڑتی ہے خواہ مخواہ ۔ یا اللہ میں کہاں

آ گئی ؟ اوپر سے تو یہ عمارت بالکل شریفوں کے رہنے کی معلوم ہوتی ہے ۔

بورڈ پر نام بھی شریفوں جیسے ہیں ! مس کوٹینو ... مس واکر ... مسز عبداللہ

مس رشید .... مسز ......

" وہ حمید صاحب تم سے پھر ملنے کو کہتے تھے " یہ وہی ایڈیٹر صاحب تھے !

ارے تو کیا اس نے واقعی مجھ سے پیشہ کرانے کا پکا فیصلہ کر لیا یعنی اپنے گاہکوں میں سے مریل مریل چھانٹ کر مجھے دیتی جائے گی۔

"بھئی آج تو ضرور تمہیں سینما لے کر جاؤں گی۔" وہ اٹھلائیں۔

"مگر مجھے تو ——— واضح رہے کہ میرا پیشہ باعزّت ہونے کے علاوہ کافی محنت طلب ہے۔"

ارے ہٹاؤ بھی تمہیں تو ہر وقت کام ہی رہتا ہے۔ حمید صاحب تمہارے لیے خاص طور پر پاس لائے ہیں اور تم ہو کہ ٹال رہی ہو۔ ارے یہی تو ہنسنے بولنے کی عمر ہے۔"

یا مولا۔ تو اب میرا مہذّب پیشہ ختم اور یہ "ہنسنے بولنے" کا پیشہ شروع ——— توبہ اگر میری اماں بچاری کو معلوم ہو تو کیا حال ہو ان کا ——— کہ ان کی نیک بیٹی کو بہکایا جا رہا ہے اور یہاں تو سودے بھی ہو گئے۔ آج پاس آ گئے کل بنارسی ساڑھی، پرسوں ہیرے کے بُندے اور اترسوں وہ خود معہ اپنے مصورانہ خیالات کے۔ اور وہ پھر ان کے وہ کھردرے سوکھے ہاتھوں سے سلیپر بنا بنا کر.... اللہ!

میں نے رکھائی سے انکار کر دیا اور وہ مضمحل سی بڑبڑاتی چلی گئیں۔

"توبہ ایسا بھی کیا ——— جبھی تو کہتے ہیں۔ اتنا پڑھانا لکھانا بھی اچھا نہیں لڑکیوں کا ———"

جی ہاں! کیوں نہیں ——— پڑھ لکھ کر کریں گی ہی کیا ——— آپ کا لطیف پیشہ سلامت رہے۔ کیا ضرورت ہے کہ دماغ پچی کرے کوئی؟ میری

سمجھ میں نہ آیا کہ باوجود اتنی بدمزاجی کے مجھ میں کیا دلچسپی تھی جو بار بار پڑوسن
آتی تھیں!

مَیں کاپیاں درست کرنے لگی۔ یا خدا یہ فیل ہونے والے بھی جان جان کر جلاتے
ہیں۔ جی چاہتا ہے۔ صفر سے بھی کوئی ذلیل تعداد ہو تو وہ نکال کر دوں انہیں۔
مریں کمبخت۔ جی چاہا جو فیل نہیں ہوئیں، ان کو بھی فیل کر دوں۔ تاکہ سب کی سب
سیٹھانی کی طرح تباہی کے غار میں گر پڑیں۔ پھر ایک دم سے مَیں نے سوچا، نہیں۔
یہ تو نہایت عجیب سزا ہوگی ـــــ بہتر یہی ہے کہ مَیں انہیں اپنی طرح قوم کی
خدمت کے لیے باہمت اور محنتی استانیاں بنا دوں ـــــ تاکہ ـــــ وہ بھی۔
ـــــ آگے سوچنے کی طاقت زنگیا کر رہ گئی۔

سیٹھانی اور نگار ہنستی کھلکھلاتی حمید صاحب اور دو چار اور بھٹکتے ہوئے عاشقوں
کے ساتھ سینما گئیں۔ جب وہ آئیں تب بھی میں جاگ رہی تھی۔ جہاں غنودگی آئی
وہاں عفریتوں نے دانت نکال کر حملہ کیا۔ بھلا اس طرح کون کام کر سکتا ہے۔ دو
چار دن اور رہی رنڈی کے پڑوس میں تو نہ جانے کیا ہو۔ میرے خیالات دن بہ
بدن الجھتے جا رہے تھے۔ خود اپنے ضمیر سے بات کرتے ڈر لگتا تھا کہ نہ جانے
کمبخت کیا بول اٹھے۔

مَیں سر پکڑے پلنگ پر بیٹھی رہی۔ تھکی ہاری سیٹھانی سو گئی تھی ـــــ فلیٹ
پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چند واہیات خیالات دل میں جھانکے ـــــ ذرا ڈھیل
دی تو ریلا کا ریلا ٹوٹ پڑا ـــــ قہقہہ پر قہقہہ میرے دماغ میں سے اُبلنے
لگا مگر میرا چہرہ نہ ہنسا......... عزت، پاکبازی...... گندے انڈے کی طرح

پوٹے کے نیچے دبائے بیٹھے رہو..... تو کیا اس میں سُرخاب نکلے گا ؟ اور پھر تماشہ یہ کہ کوئی بھی اس گندے انڈے کی سیوا کا پھل نہیں دیتا ـــــــــ قوم کو ذرا بھی احساس نہیں کہ ایک دیوی یوں پارسائی کا پٹارہ اُٹھائے - توبہ جی چاہا اُٹھا کر بیچ سڑک پر ایسی جگہ چھوڑ دوں کہ ہر آنے جانے والا غلاظت سے لتھڑ جائے۔ یہ مجھے کیا ہو رہا تھا ـــــــــ یہ سب اس رنڈی کے پڑوس میں رہنے سے ہوا! مجھے فوراً اپنی سہیلی بینا یاد آگئی ! اُف بینا کتنی حسین اور چلبلی تھی اور وہ پھر مسلسل نو سال پڑھاتی رہی اور پھر ایک دن بوکھلا کر اس نے ایک غلیظ بڈھے سے شادی کر لی ..... وہ تو کہتی تھی کہ وہ اس کی قومی خدمات دیکھ اس پر عاشق ہو گئی تھی - وہ سولہ برس کی جیل کاٹ کر آیا تھا اور کسی زمانے میں حسین بھی تھا - مگر مجھے معلوم تھا کہ بینا قوم کی خدمت کی آڑ لے رہی ہے جیسے سیٹھانی برہنہ تصویروں کی آڑ لیتی ہے ـــــــــ دراصل بھوک میں کوارٹ پاپڑ ہو جاتے ہیں -

میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ فلیٹ بدل دوں گی ورنہ جوہر بے بہا کیچڑ میں جا پڑے گا اور وہ دولت جس کے پیچھے مشرقی عورت جان دے دیتی ہے مٹی میں مل جائے گی دنیا میں عورت کی پاس عصمت ہی تو ایک شے ہے جسے کوئی پیٹ کی خاطر لٹاتی ہے تو کوئی اس کی خاطر جان لٹا دیتی ہے - لے دے کے یہی ایک ترپ کا اِکّہ ہے جو ہر داؤں پر مار سکتی ہے -

تھک ہار کر خیالات میں اُلجھی سونے کی کوشش کرنے لگی -

صبح اُٹھ کر میں جب نیچے جاتے لگی تو سیٹھانی پل والے سے ککڑی الجھ رہی تھیں، مجھے دیکھ کر غیروں کی طرح منہ پھیر لیا - فخر سے میرا سر اونچا ہو گیا - آخر کار آج مجھے یقین ہو ہی گیا کہ میں شریف ہوں ـــــــــ اور وہ بازار کی جنس !

اس کے دو چار دن کے بعد کا ذکر ہے کہ میرے ماموں زاد بھائی اور اس کی بیوی آئے۔ جب سے میں نے یہ فلیٹ لیا تھا۔ مَیں ڈر رہی تھی کہ وہ شاید یہ سن کر چراغ پا ہوں کہ مَیں ایسے پڑوس میں رہتی ہوں۔ جیسے ہی وہ آئے سیٹھانی کے فلیٹ سے قہقہے بڑی بڑی چٹانوں کی طرح لڑھک لڑھک کر گرنے لگے۔ مَیں نے اٹھ کر نفرت سے دروازہ بھیڑ دیا۔

کمبخت ہر وقت بدتمیزیاں ہوتی رہتی ہیں "

"کہاں ؟"

"یہاں کمبخت ایک طوائف رہتی ہے۔ ہر وقت ٹھٹ لگے رہتے ہیں "

"طوائف ؟ ـــــ یہاں ؟ ـــــ مگر یہ تو نگار کی آواز تھی " وہ چونکے

"ہاں ـ آپ جانتے ہیں انہیں ـ ؟" میں نے معنی خیز نظروں سے ان کی بیوی کو دیکھا

"ہاں ہاں بھئی ـ ارے تم نہیں ملیں ان سے ـ مَیں نے تو نگار کے ٹانسلز کا آپریشن کیا تھا ـ ارے یہ تو بڑے خاندانی لوگ ہیں "

"یہ ـــــ یہ ـــــ سیٹھانی ـــــ"

"ہاں بھئی ـــــ سیٹھ عبداللہ کی بیوی ـــــ سر عبدالکریم کے خاندان میں سے ہیں اور ـــــ رضیہ کی خالہ لگتی ہیں ـــــ"

"خالہ " رضیہ بولیں ـ

اور میں حیرت زدہ ان عبرت ناک زلزلوں کو چھپانے کی کوشش کرنے لگی سن رہ گئی ـ جیسے مَیں نے کسی مقدس کتاب کو ٹھوکر مار دی ہو ـــــ اور ـ کفارہ ـ ؟ ـــــ کفارہ میرے امکان سے باہر ہو ـ"

"تو ـــــ تو وہ کوئی دوسرا فلیٹ ہوگا " مَیں نے ہکلا کر کہا ـ

● ● ● ● ●

سعادت حسن منٹو

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی۔ ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور گھر کو واپس گیا تھا۔

وہ رات کو یہاں بھی ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اسے بیحد پریم کرتی تھی۔

وہ روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغہ سے حاصل کئے تھے اس کی چست اور تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو ابھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے کھنکھنانے لگتے اور ان کی یہ کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے۔

اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی کچھ تو اس برانڈی کے باعث تھی جس کا ادھا داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ اس "بیوڑا" کا نتیجہ تھی جس کا سوڈا ختم ہوتے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔

وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے مُنہ لیٹی تھی، اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں پتنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں، جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔

دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا، جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا جیسے نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پر رکھ دیا گیا تھا۔

کمرہ بہت چھوٹا تھا جس میں بے شمار چیزیں بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں۔ تین چار سوکھے سڑے چپل پلنگ کے نیچے پڑے تھے جن کے اوپر منہ رکھ کر ایک خارش زدہ کتا سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس کتے کے بال جگہ جگہ سے خارش کے باعث اڑے ہوئے تھے۔ دور سے اگر کوئی اس کتے کو دیکھتا تو سمجھتا کہ پیر پونچھنے والا پرانا ٹاٹ دوہرا کر کے زمین پر رکھا ہے۔

اس طرح چھوٹے سے دیوار گیر پر سنگار کا سامان رکھا تھا۔ گالوں پر لگانے کی سرخی، ہونٹوں کی سرخ بتی، پاؤڈر، کنگھی اور لوہے کے پن جو وہ غالباً اپنے جوڑے میں لگایا کرتی تھی۔ پاس ہی ایک کھونٹی پر سبز طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا جو گردن کو اپنی پیٹھ کے بالوں میں چھپائے سو رہا تھا۔ پنجرہ کچے امرود کے ٹکڑوں اور گلے ہوئے سنگترے کے چھلکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان بدبودار ٹکڑوں پر چھوٹے چھوٹے کالے رنگ کے پتنگے یا مچھر اڑ رہے تھے۔

پلنگ کے پاس ہی بید کی ایک کرسی پڑی تھی جس کی پشت سر ٹیکنے کے باعث بیحد میلی ہو رہی تھی۔ اس کرسی کے دائیں ہاتھ کو ایک خوبصورت تپائی تھی جس پر ہز ماسٹرز وائس کا پورٹ ٹیبل گراموفون پڑا تھا۔ اس گراموفون پر منڈھے ہوئے

کالے کپڑے کی بہت بُری حالت تھی۔ زنگ آلود سوئیاں تپائی کے علاوہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس تپائی کے عین اُوپر دیوار پر چار فریم لٹک رہے تھے جن پر مختلف آدمیوں کی تصویریں جڑی تھیں۔

ان تصویروں سے ذرا ہٹ کر یعنی دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف کے کونے میں گنیش جی کی شوخ رنگ تصویر تھی جو تازہ اور سوکھے ہوئے پھولوں سے لدی تھی۔ شاید یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے اُتار کر فریم میں جڑوائی گئی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ چھوٹے سے دیوار گیر پر جو کہ بے حد چکنا ہو رہا تھا تیل کی ایک پیالی دھری تھی جو دیئے کو روشن کرنے کے لئے وہاں رکھی گئی تھی۔ پاس ہی دیا پڑا تھا جس کی لَو ہوا بند ہونے کے باعث ماتھے کے تلک کے مانند سیدھی کھڑی تھی۔ اس دیوار گیر پر دھوپ کی چھوٹی بڑی مروڑیاں بھی پڑی تھیں۔

جب بوہنی کرتی تھی تو دور سے گنیش جی کی اِس مورتی سے روپے چھوا کر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ لگا کر انہیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی۔ اس کی چھاتیاں چونکہ کافی اُبھری ہوئی تھیں اس لیے وہ جتنے روپے بھی اپنی چولی میں رکھتی محفوظ پڑے رہتے تھے، البتہ کبھی کبھی جب مادھو پُونے سے چھٹی لے کر آتا تو اُسے اپنے کچھ روپے پلنگ کے پائے کے نیچے اس چھوٹے سے گڑھے میں چھپانے پڑتے تھے، جو اس نے خاص اس کام کی غرض سے کھدوایا تھا۔ مادھو سے روپے محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ سوگندھی کو رام لال دلّال نے بتایا تھا۔ اُس نے جب یہ سنا تھا کہ مادھو پُونے سے آکر سوگندھی پر دھاوا بولتا ہے تو کہا تھا:

"اس سالے کو تو نے کب سے یار بنایا ہے؟ — یہ بڑی انوکھی عاشقی معشوقی ہے

ا۔ سالا ایک پیسہ اپنی جیب سے نکالتا نہیں اور تیرے ساتھ مزے اڑاتا رہتا ہے
مزے الگ رہے تجھ سے کچھ لے بھی مرتا ہے ــــ سوگندھی، مجھے کچھ دال میں
کالا کالا نظر آتا ہے۔ اس سالے میں کوئی بات ضرور ہے جو تجھے بھا گیا ہے۔ سات
سال سے یہ دھندا کر رہا ہوں۔ تم چھوکریوں کی ساری کمزوریاں جانتا ہوں۔"

یہ کہہ کر رام لال نے، جو بمبئی شہر کے مختلف حصّوں سے دس روپے سے لیکر
سو روپے تک والی ایک سو بیس چھوکریوں کا دھندا کرتا تھا۔ سوگندھی کو بتایا:

"سالی، اپنا دھندا یوں برباد نہ کر ــــ تیرے انگ پر سے یہ کپڑے بھی
اتار کر لے جائے گا۔ وہ تیری ماں کا یار! ــــ اس پلنگ کے پائے کے نیچے چھوٹا
سا گڑھا کھود کر اس میں سارے پیسے دبا دیا کر اور جب وہ یار آیا کرے تو اس سے
کہا کر:

"تیری جان کی قسم مادھو، آج صبح سے ایک دھیلے کا منہ نہیں دیکھا۔ باہر والے
سے کہہ کر ایک کوپ چائے اور ایک افلاطون بسکٹ تو منگا بھوک سے میرے پیٹ
میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔"

سمجھیں بہت نازک وقت آگیا ہے، میری جان۔ اس سالی کانگرس نے شراب
بند کر کے بازار بالکل مندا کر دیا ہے۔ پر تجھے تو کہیں نہ کہیں سے پینے کو مل ہی جاتی
ہے۔ بھگوان قسم، جب تیرے یہاں کبھی رات کی خالی کی ہوئی بوتل دیکھتا ہوں اور
داروُ کی باس سونگھتا ہوں تو جی چاہتا ہے تیری جُون میں چلا جاؤں۔"

سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار جمنا نے اُس
سے کہا تھا: "نیچے سے ان بم کے گولوں کو باندھ کے رکھا کر۔ انگیا پہنا کرے گی

تو ان کی سنخانی ٹھیک رہے گی ۔"

سوگندھی یہ سن کر ہنس دی ۔" جمنا تو سب کو اپنی سری کا سمجھتی ہے ۔ دس روپے میں لوگ تیری بوٹیاں توڑ کر چلے جاتے ہیں اور تو سمجھتی ہے کہ سب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا ــــ کوئی موا لگائے تو ایسی ویسی جگہ ہاتھ ــــ ارے ہاں کل کی بات تجھے سناؤں ۔ رام لال رات کے دو بجے ایک پنجابی کو لایا ۔ رات کا تیس روپے طے ٹھہرا ــــ جب سونے لگے تو میں نے بتی بجھادی ۔ ارے وہ تو ڈرنے لگا ! ــــ سنتی ہو جمنا ؟ تیری قسم اندھیرا ہوتے ہی اس کا سارا ٹھاٹھ کرکرا ہوگیا وہ ڈر گیا ! میں نے کہا ۔" چلو چلو دیر کیوں کرتے ہو ؟ تین بجنے والے ہیں ، ابھی دن چڑھ آئے گا ــــ بولا ..... روشنی کرو ۔"

میں نے کہا " یہ روشنی کیا ہوا ؟"

بولا " لائٹ ، لائٹ ! ۔"

اس کی بھنچی ہوئی آواز سن کر مجھ سے ہنسی نہ رکی ۔" بھئی میں تو لائٹ نہ کروں گی !" اور یہ کہہ کر میں نے اس کی گوشت بھری ران میں چٹکی لی ــــ تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور لائٹ آن کر دی ۔ میں نے جھٹ سے چادر اوڑھ لی اور کہا ۔

" تجھے شرم نہیں مردوے !"

وہ پلنگ پر آیا تو میں اٹھی اور لپک کر لائٹ بجھادی ۔ وہ پھر گھبرانے لگا ۔ تیری قسم بڑے مزے میں رات کٹی ۔ کبھی اندھیرا کبھی اجالا ۔ کبھی اجالا کبھی اندھیرا .....'

ٹرام کی کھڑکھڑ ہوئی تو پتلون وتلون پہن کر وہ اٹھ بھاگا ــــ سالے نے تیس روپے سٹے میں جیتے ہوں گے ، جو یوں مفت دے گیا ــــ جمنا تو بالکل الھڑ

ہے ، بڑے بڑے گر یاد ہیں مجھے ان لوگوں کے ٹھیک کرنے کے لئے ۔"

سوگندھی کو واقعی بہت سے گر یاد تھے جو اس نے اپنی ایک دو سہیلیوں کو بتائے بھی تھے ۔ عام طور پر وہ یہ گر سب کو بتایا کرتی تھی ۔

"اگر آدمی شریف ہو ، زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو تو اس سے خوب شرارتیں کرو ، اسے چھیڑو ، ستاؤ ، اس کے گدگدی کرو ، اس سے کھیلو ۔ اگر داڑھی رکھتا ہو تو اس میں انگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال بھی نوچ لو ۔ پیٹ بڑا ہو تو تھپتھپاؤ ، اس کو اتنی مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے وہ خوش خوش چلا جائے گا اور تم بھی بچی رہو گی ۔ ایسے مرد جو گپ چپ رہتے ہیں بڑے خطرناک ہوتے ہیں بہن ——— ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے !"

سوگندھی اتنی چالاک نہیں تھی جتنی کہ خود کو ظاہر کرتی تھی ۔ اس کے گاہک بہت کم تھے ۔ غایت درجہ جذباتی لڑکی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گر جو اسے یاد تھے اس کے دماغ سے پھسل کر اس کے پیٹ میں آجاتے تھے ۔ جس پر ایک بچہ پیدا کرنے کے باعث کئی لکیریں پڑ گئی تھیں ۔ ان لکیروں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر اسے ایسا لگا تھا کہ اس کے خارش زدہ کتے نے اپنے پنجے سے یہ نشان بنا دیئے ہوں ۔ جب کوئی کتیا بڑی بے اعتنائی سے اس کے پالتو کتے کے پاس سے گزر جاتی تھی تو وہ شرمندگی دور کرنے کے لئے زمین پر اسی قسم کے نشان اپنے پنجوں سے بنایا کرتا تھا ۔

سوگندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی لیکن جونہی کوئی نرم و نازک بات ، کوئی کومل بول اس سے کہتا وہ جھٹ پگھل کر اپنے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی ۔ گو

مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا مگر اس کے جسم کے باقی اعضا سب کے سب اس کے بہت بری طرح قائل تھے۔ وہ تھکن چاہتے تھے ایسی تھکن جو انہیں جھنجھوڑ کر، انہیں مار کر سلانے پر مجبور کر دے۔ ایسی نیند جو تھک کر چُور چُور ہونے کے بعد آتی ہے کتنی مزیدار ہوتی ہے وہ بیہوشی جو مار کھا کے بند بند ڈھیلے ہو جاتے پر طاری ہوتی ہے کتنا آنند دیتی ہے ۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہو اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں ہو، اور اس ہونے نہ ہونے کے بیچ میں کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ تم ہوا میں بہت اونچی جگہ لٹکی ہوئی ہو۔ اُوپر ہوا، نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا بس ہوا ہی ہوا! اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزا دیتا تھا۔

بچپن میں جب وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی اور اپنی ماں کا بڑا صندوق کھول کر چھپ جایا کرتی تھی تو ناکافی ہوا میں دم گھٹنے کے ساتھ ساتھ پکڑے جانے کے خوف سے وہ تیز دھڑکن جو اس کے دل میں پیدا ہو جایا کرتی تھی کتنا مزا دیا کرتی تھی۔

سوگندھی چاہتی تھی کہ اپنی ساری زندگی کسی ایسے ہی صندوق میں چھپ کے گزار دے جس کے باہر ڈھونڈنے والے پھرتے رہیں۔ کبھی کبھی اس کو ڈھونڈ نکالیں تاکہ وہ بھی ان کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے!۔

یہ زندگی جو وہ پانچ برس سے گزار رہی تھی آنکھ مچولی ہی تو تھی، کبھی وہ کسی کو ڈھونڈ لیتی تھی اور کبھی کوئی اسے ڈھونڈ لیتا تھا۔ بس یونہی اس کا جیون بیت رہا تھا۔ وہ خوش تھی اس لئے کہ اس کو خوش رہنا پڑتا تھا۔ ہر روز رات کوئی نہ کوئی

مرد اس کے چوڑے ساگوانی پلنگ پر ہوتا تھا اور سوگندھی ، جسے مردوں کو ٹھیک کرنے کے بے شمار گُر یاد تھے اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ ان مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ بڑے روکھے پن کے ساتھ پیش آئے گی ۔ ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی اور فقط ایک پیاسی عورت رہ جایا کرتی تھی ۔

ہر روز رات کو اس کا پُرانا یا نیا ملاقاتی اس سے کہا کرتا تھا ’’ سوگندھی ! میں تجھ سے پریم کرتا ہوں ‘‘ اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے ، بس موم ہو جایا کرتی تھی ۔ اور ایسا محسوس کرتی جیسے سچ مُچ اس سے پریم کیا جا رہا ہے ــــ پریم ــــ کتنا سندر بول ہے ! وہ چاہتی تھی اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگوں پر مَل لے ۔ اس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے ۔ یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے ۔ سمٹ سمٹا کر اس کے اندر داخل ہو جائے اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے ۔ کبھی کبھی جب پریم کرنے اور پریم کئے جانے کا جذبہ اس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اس کے جی میں آتا کہ وہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دے اور لوریاں دے کر اُسے اپنی گود ہی میں سُلا دے ۔

پریم کر سکنے کی اہلیت اس میں اس قدر زیادہ تھی کہ ہر اس مرد سے جو اس کے پاس آتا تھا وہ محبت کر سکتی تھی اور پھر اس کو نباہ بھی سکتی تھی ۔ اب تک چار مردوں سے اپنا پریم نباہ ہی تو رہی تھی ۔ جن کی تصویریں اس کے سامنے دیوار پر لٹک رہی تھیں ۔ ہر وقت یہ احساس اس کے دل میں موجود رہتا تھا کہ وہ بہت

اچھی ہے۔ لیکن یہ اچھاپن مردوں میں کیوں نہیں ہوتا؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ایک بار آئینہ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا تھا "سوگندھی! تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا!"

یہ زمانہ یعنی پانچ برسوں کے دن اور ان کی راتیں اس کے جیون کے ہر تار کے ساتھ وابستہ تھا۔ گو اس زمانے سے اس کو خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی جس کی خواہش اس کے دل میں موجود تھی۔ تاہم وہ چاہتی تھی کہ یونہی اس کے دن بیتتے چلے جائیں۔ اُسے کون سے محل کھڑے کرنے تھے جو روپے پیسے کا لالچ کرتی۔ دس روپے اس کا عام نرخ تھا جس میں سے ڈھائی روپے رام لال اپنی دلالی کے کاٹ لیتا تھا۔ ساڑھے سات روپے اسے روز مل ہی جایا کرتے تھے جو اس کی اکیلی جان کے لئے کافی تھے اور مادھو جب پُونے سے بقول رام لال دلال سوگندھی پر دھاوا بولنے آتا تھا تو وہ دس پندرہ روپے خراج بھی ادا کرتی تھی۔ یہ خراج صرف اس بات کا تھا کہ سوگندھی کو اس سے کچھ وہ ہو گیا تھا۔ رام لال دلال ٹھیک کہتا تھا، اس میں ایسی بات ضرور تھی جو سوگندھی کو بہت بھاگئی تھی۔ اب اسے چھپا کیا رہے بتا ہی کیوں نہ دیں! سوگندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہوئی تھی تو اس نے کہا تھا۔ "تجھے لاج نہیں آتی اپنا بھاؤ کرتے جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟ — چھی چھی — دس روپے اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپے دلال کے، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟ — اب ان ساڑھے سات ڈبلیوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا وچن جو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں ایسی چیز لینے آیا ہوں جو میں لے ہی نہیں

سکتا ـــــ مجھے عورت چاہیے، پر تجھے کیا اس وقت، اسی گھڑی تجھے مرد چاہیے؟
مجھے تو عورت بھی بھا جائے گی پر کیا میں تجھے جچتا ہوں ـــــ تیرا میرا ناطہ ہی کیا ہے
کچھ بھی نہیں ـــــ بس یہ دس روپے جن میں سے دلالی میں چلے جائیں گے اور
باقی اِدھر اُدھر بکھر جائیں گے تیرے میرے بیچ میں نچ رہے ہیں۔ تو بھی ان کا
بجنا سُن رہی ہے اور مَیں بھی۔ تیرا من کچھ اور سوچتا ہے میرا من کچھ اور ـــــ
کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری۔ پُونے
میں حوالدار ہوں۔ مہینے میں ایک بار آیا کروں گا تین چار دن کے لئے۔ یہ دھندا
چھوڑ۔ مَیں تجھے خرچ دیا کروں گا۔ کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا۔؟"

مادھو نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا، جس کا اثر سوگندھی پر اس قدر زیادہ ہوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لئے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی۔ باتیں کرنے کے بعد مادھو نے اس کے کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں اور ننگی تصویریں جو سوگندھی نے اپنے سرھانے لٹکا رکھی تھیں، بنا پُوچھے گچھے پھاڑ دی تھیں اور کہا تھا:

"سوگندھی! بھئی مَیں ایسی تصویریں نہیں رکھنے دوں گا۔ اور پانی کا یہ گھڑا۔ دیکھنا۔ کتنا میلا اور یہ ـــــ یہ چیتھڑے ـــــ یہ چندیاں ـــــ اُف کتنی بری باس آتی ہے، اُٹھا کے باہر پھینک ان کو ـــــ اور تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے ـــــ اور ـــــ اور ـــــ"

تین گھنٹے کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو دونوں آپس میں گھل مل گئے تھے اور سوگندھی کو تو ایسا محسوس ہوا تھا کہ برسوں سے حوالدار کو جانتی ہے
اس وقت تک کسی نے بھی کمرے میں بدبودار چیتھڑوں، میلے گھڑے اور ننگی تصویروں

کی موجودگی کا خیال نہیں کیا تھا اور نہ کبھی کسی نے اس کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا تھا کہ اس کا ایک گھر ہے جس میں گھریلو پن آسکتا ہے ۔ لوگ آتے تھے اور بستر تک کی غلاظت کو محسوس کئے بغیر چلے جاتے تھے ۔ کوئی سوگندھی سے یہ نہیں کہتا تھا "دیکھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے کہیں زکام نہ ہو جائے تجھے ــــــ ٹھہر میں تیرے واسطے دوا لاتا ہوں "۔ مادھو کتنا اچھا تھا ۔ اس کی ہر بات باون تولہ اور پاؤ رتی کی تھی ۔ کیا کھری کھری سنائی تھیں اس نے سوگندھی کو ــــــ اسے ــــــ محسوس ہونے لگا کہ اسے مادھو کی ضرورت ہے ۔ چنانچہ ان دونوں میں سمبندھ ہو گیا ۔

مہینے میں ایک بار مادھو پونے سے آتا تھا اور واپس جاتے ہوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا "دیکھ سوگندھی، اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی ــــــ اگر تو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا ــــــ دیکھ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا ــــــ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا ...."

نہ مادھو نے کبھی پونا سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا دونوں اچھی طرح جانتے تھے، کیا ہو رہا ہے ۔ نہ سوگندھی نے کبھی مادھو سے یہ کہا تھا ۔ " تو یہ ٹر ٹر کیا کرتا ہے، ایک پھوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تو نے " اور نہ مادھو نے کبھی سوگندھی سے پوچھا تھا " یہ مال تیرے پاس کہاں سے آیا ہے ۔ جب کہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں " ــــــ دونوں

جھوٹے تھے ۔ دونوں ایک ملمع کی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے ـــــ لیکن سوگندھی خوش تھی ۔ جس کو اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ ملمع کیے ہوئے گہنوں پر راضی ہو جایا کرتی ہے ۔

اس وقت سوگندھی تھکی ماندی سو رہی تھی ۔ بجلی کا قمقمہ جسے وہ اُوف کرنا بھول گئی تھی اس کے سر کے اوپر لٹک رہا تھا ۔ اس کی تیز روشنی اس کی مندی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ٹکرا رہی تھی مگر وہ گہری نیند سو رہی تھی ۔

دروازے پر دستک ہوئی ـــــ رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا ۔ ؟

سوگندھی کے خواب آلود کانوں میں دستک کی آواز بھنبھناہٹ بن کر پہنچی ۔ دروازہ جب زور سے کھٹکھٹایا گیا تو چونک کر اُٹھ بیٹھی ـــــ ملی جُلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے منہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کیلا اور لیسدار تھا ۔ دھوتی کے پلو سے اس نے یہ بدبودار لعاب صاف کیا ۔ اور آنکھیں مَلنے لگی پلنگ پر وہ اکیلی تھی ۔ جھک کر اس نے پلنگ کے نیچے دیکھا تو اس کا کتا چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا اور طوطا پیٹھ کے بالوں میں سر دیئے سو رہا تھا ۔

دروازے پر دستک ہوئی ۔ سوگندھی بستر پر سے اٹھی ۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا ۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اس نے کلی کی اور دوسرا ڈونگا نکال کر غٹاغٹ پی کر اس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا ۔

"رام لال" ؟

رام لال جو باہر دستک دیتے دیتے تھک گیا تھا ۔ بھنا کر کہنے لگا : "تجھے

سانپ سونگھ گیا تھا۔ ایک کلاک (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں کہاں سر گئی تھی“؟ ــــــ پھر آواز دبا کر اس نے ہولے سے کہا۔”اندر کوئی ہے تو نہیں“؟

جب سوگندھی نے کہا ”نہیں ــــــ تو رام لال کی آواز پھر اونچی ہو گئی ”تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی۔؟ ــــــ بھئی حد ہو گئی ہے۔ کیا نیند پائی ہے یوں ایک ایک چھوکری اتارنے میں دو دو گھنٹے سر کھپانا پڑے تو میں اپنا دھندا کر چکا ــــــ اب تو میرا منہ کیا دیکھتی ہے۔ جھٹ پٹ یہ دھوتی اتار وہ پھولوں والی ساڑھی پہن پوڈر ووڈر لگا اور چل میرے ساتھ ــــــ باہر موٹر میں ایک سیٹھ بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں۔ چل چل ایک دم جلدی کر“

سوگندھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور رام لال آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

سوگندھی نے تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بام کی شیشی اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا۔”رام لال آج میرا جی اچھا نہیں“

رام لال نے کنگھی دیوار گیر پہ رکھ دی اور مڑ کر کہا ”تو پہلے کہہ دیا ہوتا“

سوگندھی نے ماتھے اور کن پٹیوں پر بام ملتے ہوئے رام لال کی غلط فہمی دور کر دی ”وہ بات نہیں رام لال! ــــــ ایسے ہی میرا جی اچھا نہیں ــــــ بہت پی گئی“

رام لال کے منہ میں پانی بھر آیا۔”تھوڑی بچی ہو تو لا ــــــ ذرا ہم بھی منہ کا مزا ٹھیک کر لیں“

سوگندھی نے بام کی شیشی تپائی پر رکھ دی اور کہا۔ "بجائی ہوتی تو یہ موا سر میں درد ہی کیوں ہوتا ــــــ دیکھ رام لال! وہ جو باہر موٹر میں بیٹھا ہے۔ اُسے اندر ہی لے آؤ۔"

رام لال نے جواب دیا۔ "نہیں بھئی وہ اندر نہیں آسکتے۔ جنٹلمین آدمی ہیں وہ تو موٹر کو گلی کے باہر کھڑی کرتے بھی گھبراتے تھے ــــــ تو کپڑے وپڑے پہن لے اور ذرا گلی کے نکڑ تک چل ــــــ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ساڑھے سات روپے کا سودا تھا۔ سوگندھی اس حالت میں جب کہ اس کے سر میں سخت درد ہو رہا تھا، کبھی قبول نہ کرتی۔ مگر اسے روپوں کی سخت ضرورت تھی اس کے ساتھ والی کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی جس کا خاوند موٹر کے نیچے آکر مر گیا تھا۔ اس عورت کو اپنی جوان لڑکی سمیت اپنے وطن جانا تھا مگر چونکہ اس کے پاس کرایہ ہی نہ تھا۔ اس لئے وہ کسمپرسی کی حالت میں پڑی تھی۔ سوگندھی نے کل ہی اُسے ڈھارس دی تھی اور اس سے کہا تھا۔ "بہن تو چنتا نہ کر میرا مرد پُونے سے آنے ہی والا ہے۔ میں اس سے کچھ روپے لے کر تیرے جانے کا بندوبست کر دوں گی۔" مادھو پُونے سے آنے والا تھا مگر روپوں کا بندوبست تو سوگندھی کو کرنا تھا۔ چنانچہ وہ اٹھی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ پانچ منٹ میں اس نے دھوتی اتار کر پھولوں والی ساڑھی پہنی اور گالوں پر سرخ پوڈر لگا کر تیار ہو گئی۔ گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک اور ڈونگا پیا۔ رام لال کے ساتھ ہو لی۔

گلی جو کہ چھوٹے شہروں کے بازار سے بھی کچھ بڑی تھی۔ بالکل خاموش تھی گیس کے وہ لیمپ جو کھمبوں پر جڑے تھے، پہلے کی نسبت بہت دھندلی روشنی

دے رہے تھے۔ جنگ کے باعث ان کے شیشوں کو گدلا کر دیا گیا تھا۔ اس اندھی روشنی میں گلی کے آخری سرے پر ایک موٹر نظر آ رہی تھی ———

کمزور روشنی میں اس سیاہ رنگ کی موٹر کا سایہ سا نظر آنا اور رات کے پچھلے پہر کی بھیدوں بھری خاموشی ——— سوگندھی کو ایسا لگا کہ اس کے سر کا درد فضا پر بھی چھا گیا ہے۔ ایک کسیلا پن اسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا۔ جیسے برانڈی اور بیوڑا کی باس سے وہ بھی بوجھل ہو رہی ہے۔

آگے بڑھ کر رام لال نے موٹر کے اندر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا۔ اتنے میں جب سوگندھی موٹر کے پاس پہنچ گئی تو رام لال نے ایک طرف ہٹ کر کہا:

"لیجئے وہ آ گئی ——— بڑی اچھی چھوکری ہے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں اسے دھندا شروع کئے" ——— پھر سوگندھی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "سوگندھی، ادھر آ۔ سیٹھ جی بلاتے ہیں"

سوگندھی ساڑھی کا ایک کنارہ اپنی انگلی پر لپیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور موٹر کے دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ صاحب نے بیٹری اس کے چہرے کے پاس روشن کی۔ ایک لمحے کے لئے اس روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں چکاچوند پیدا کی۔ بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی اور روشنی بجھ گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ صاحب کے منہ سے "اونہہ" نکلا۔ پھر ایک دم موٹر کا انجن پھڑپھڑایا اور کار یہ جا وہ جا........

سوگندھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موٹر چل دی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک بیٹری کی تیز روشنی گھسی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو

نہ دیکھ سکی تھی۔ یہ آخر ہوا کیا تھا۔ اس "اونہہ" کا کیا مطلب تھا جو ابھی تک اس کے کانوں میں بھنبھنا رہی تھی۔ کیا؟ ...... کیا؟

رام لال دلال کی آواز سنائی دی۔ "پسند نہیں کیا تجھے؟ ——— اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔ دو گھنٹے مفت ہی میں برباد کئے!"

یہ سن کر سوگندھی کی ٹانگوں میں، اس کے ہاتھوں میں ایک زبردست حرکت پیدا ہوئی۔ "کہاں ہے وہ موٹر ——— کہاں ہے وہ سیٹھ ——— تو "اونہہ" کا مطلب یہ تھا کہ اس نے مجھے پسند نہیں کیا ——— اس کی ...."

گالی اس کے پیٹ کے اندر سے اٹھی اور زبان کی نوک پر آ کر رک گئی۔ وہ آخر گالی کسے دیتی۔ موٹر تو جا چکی تھی۔ اس کی دُم کی سُرخ بتی اس کے سامنے بازار کے اندھیارے میں ڈوب رہی تھی اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لال انگارہ "اونہہ" ہے جو اس کے سینے میں برمے کی طرح اترا چلا جا رہا ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ زور سے پکارے "او سیٹھ ——— او سیٹھ ——— ذرا موٹر روکنا اپنی ——— بس ایک منٹ کے لئے۔" پر وہ سیٹھ تھری ہے اُس کی ذات پر بہت دُور نکل چکا تھا۔

وہ سنسان بازار میں کھڑی تھی۔ پھولوں والی ساڑھی جو وہ خاص موقعوں پر پہنا کرتی تھی، رات کے پچھلے پہر کی ہلکی پھلکی ہوا سے لہرا رہی تھی۔ یہ ساڑھی اور اس کی ریشمیں سرسراہٹ سوگندھی کو کتنی بُری معلوم ہوتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس ساڑھی کے چیتھڑے اڑا دے کیونکہ ساڑھی ہوا میں لہرا کر "اونہہ اونہہ" کر رہی تھی۔

گالوں پر اس نے پوڈر لگایا تھا اور ہونٹوں پر سُرخی - جب اِسے خیال آیا کہ یہ سنگار اس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے واسطے کیا تھا تو شرم کے مارے اُسے پسینہ آگیا - یہ شرمندگی دُور کرنے کے لئے اس نے کیا کچھ نہ سوچا —— میں نے اس موئے کو دکھانے کے لئے تھوڑی اپنے آپ کو سجایا تھا یہ تو میری عادت ہے —— میری کیا سب کی عادت ہے —— پر —— پر —— یہ رات کے دو بجے اور رام لال دلّال اور —— یہ بازار —— اور وہ موٹر اور بیٹری کی چمک —— یہ سوچتے ہی روشنی کے دھبّے اس کی حدِ نگاہ تک فضا میں اِدھر اُدھر تیرنے لگے اور موٹر کے انجن کی سی پھڑپھڑاہٹ اُسے ہوا کے ہر جھونکے میں سنائی دینے لگی -

اس کے ماتھے پر بام کا لیپ جو سنگار کرنے کے دوران میں بالکل ہلکا ہو گیا تھا - پسینہ آنے کے باعث اس کے مساموں میں داخل ہونے لگا اور سوگندھی کو اپنا ماتھا کسی اور کا ماتھا معلوم ہوا - جب ہوا کا ایک جھونکا اس کے عرق آلود ماتھے کے پاس سے گزرا تو اُسے ایسا لگا کہ سرد سرد ٹین کا ٹکڑا کاٹ کر اس کے ماتھے کے ساتھ چپاں کر دیا گیا ہے - سر میں درد ویسے کا ویسا موجود تھا مگر خیالات کی بھیڑ بھاڑ اور اس کے شور نے اس درد کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا - سوگندھی نے کئی بار اس درد کو اپنے خیالات کے نیچے سے نکال کر اوپر لانا چاہا مگر ناکام رہی - وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انگ انگ دکھنے لگے - اس کے سر میں درد ہو، اس کی ٹانگوں میں درد ہو، اس کے پیٹ میں درد ہو اس کی باہوں میں درد ہو - ایسا درد کہ وہ صرف درد ہی کا خیال کرے اور سب

کچھ بھول جائے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کے دل میں کچھ ہوا۔ ——— کیا یہ درد تھا؟ ——— ایک لمحے کے لئے اس کا دل سکڑا، اور پھر پھیل گیا ——— یہ کیا تھا؟...... لعنت! یہ تو وہی "اُونہہ" تھی جو اس کے دل کے اندر کبھی سکڑتی اور کبھی پھیلتی تھی۔

گھر کی طرف سوگندھی کے قدم اُٹھے ہی تھے کہ رُک گئے اور وہ ٹھہر کر سوچنے لگی۔ "رام لال دلاّل کا خیال ہے کہ اُسے میری شکل پسند نہیں آئی ——— شکل کا تو اس نے ذکر نہیں کیا۔ اس نے تو یہ کہا تھا" سوگندھی تجھے پسند نہیں کیا!۔ اُسے ——— اُسے ——— صرف میری شکل ہی پسند نہیں آئی ——— نہیں آئی تو کیا ہوا۔؟ ——— مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آتی ——— وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا۔ کتنی بُری صورت تھی اس کی ——— کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی۔؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تو مجھے گھن نہیں آئی تھی؟ ——— کیا مجھے ابکائی آتے آتے رک نہیں گئی تھی؟ ——— ٹھیک ہے، پر سوگندھی ——— تو نے اسے دھتکارا نہیں تھا، تو نے اس کو ٹھکرایا نہیں تھا ——— اس موٹر والے سیٹھ نے تو تیرے مُنہ پر تھوکا ہے ——— اُونہہ ——— اس "اُونہہ" کا اور مطلب ہی کیا ہے۔! ——— یہی کہ اس چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل ——— اُونہہ ——— یہ مُنہ اور مسور کی دال ——— ارے رام لال تو یہ چھپکلی کہاں سے پکڑ کر لے آیا ہے ——— اس لونڈیا کی اتنی تعریف کر رہا ہے تو ——— دس روپے اور یہ عورت ——— خچر کیا بُری ہے.......!"

سوگندھی سوچ رہی تھی اور اس کے پیر کے انگوٹھے سے لیکر سر کی چوٹی تک گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا اور کبھی رام لال پر جس نے رات کے دو بجے اسے بے آرام کیا۔ لیکن فوراً ہی دونوں کو بے قصور پاکر وہ سیٹھ کا خیال کرتی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھیں، اس کے کان اس کی بانہیں، اس کی ٹانگیں، اس کا سب کچھ مڑتا تھا کہ اس سیٹھ کو کہیں دیکھ پائے ——— اس کے اندر یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے ایک بار پھر ہو ——— صرف ایک بار........ وہ ہولے ہولے موٹر کی طرف بڑھے، موٹر کے اندر سے ایک ہاتھ بیٹری نکالے اور اُس کے چہرے پر روشنی پھینکے۔ "اُونہہ" کی آواز آئے اور وہ ——— سوگندھی ——— اندھا دھند اپنے دونوں پنجوں سے اس کا منہ نوچنا شروع کر دے وحشی بلّی کی طرح جھپٹے اور ——— اور اپنی انگلیوں کے سارے ناخن جو اس نے موجودہ فیشن کے مطابق بڑھا رکھے تھے۔ اس سیٹھ کے گالوں پر گاڑ دے ——— بالوں سے پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑا دھڑ مکّے مارنا شروع کر دے اور جب تھک جائے تو ——— جب تھک جائے تو رونا شروع کر دے۔

رونے کا خیال سوگندھی کو صرف اس لئے آیا کہ اس کی آنکھوں میں غصّے اور بے بسی کی شدّت کے باعث تین چار بڑے بڑے آنسو بن رہے تھے۔ ایکا ایکی سوگندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا "تم روتی کیوں ہو؟ تمہیں کیا ہوا ہے کہ ٹپکنے لگی ہو؟" ——— آنکھوں سے کیا ہوا سوال چند لمحات تک اُن آنسوؤں

میں تیر نا رہا جو اب پلکوں پر کانپ رہے تھے۔ سوگندھی ان آنسوؤں میں سے دیر تک اُس خلا کو گھورتی رہی جدھر سیٹھ کی موٹر گئی تھی۔

——— پھڑ پھڑ پھڑ ——— یہ آواز کہاں سے آئی؟ ——— سوگندھی نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ لیکن کسی کو نہ پایا ——— ارے! یہ تو اس کا دل پھڑپھڑایا تھا۔ وہ سمجھی تھی موٹر کا انجن بولا ہے ——— اُس کا دل، یہ کیا ہو گیا تھا اس کے دل کو ——— آج ہی یہ روگ لگ گیا تھا اُسے ——— اچھا بھلا چلتا چلتا ایک جگہ رُک کر دھڑ دھڑ کیوں کرتا تھا ——— بالکل اس گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح جو سوئی کے نیچے ایک جگہ آکے رُک جاتا تھا۔ ”رات کٹی گِن گِن تارے“ کہتا کہتا تارے تارے کی رٹ لگا دیتا تھا۔

آسمان تاروں سے اٹا ہوا تھا۔ سوگندھی نے ان کی طرف دیکھا اور کہا: ”کتنے سُندر ہیں“ ——— وہ چاہتی تھی کہ اپنا دھیان کسی اور طرف پلٹ دے پر جب اس نے سُندر کہا تو جھٹ سے یہ خیال اس کے دماغ میں کُودا ”یہ تارے سندر ہیں تُو کتنی بھونڈی ہے ——— کیا بھول گئی کہ ابھی ابھی تیری صورت کو پھٹکارا گیا ہے؟“

سوگندھی بدصورت تو نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام عکس ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے جو ان پانچ برسوں کے دوران میں وہ آئینے میں دیکھ چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کا رنگ روپ اب وہ نہیں رہا تھا جو آج سے پانچ برس پہلے تھا۔ جب وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ لیکن وہ بدصورت تو نہیں ہو گئی تھی۔ اس کی شکل وصورت اُن عام عورتوں کی سی تھی۔ جن کی طرف مرد گزرتے گزرتے گھور کے دیکھ لیا کرتے

ہیں۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو سوگندھی کے خیال میں ہر مرد اُس عورت میں ضروری سمجھتا ہے جس کے ساتھ اسے ایک دو راتیں بسر کرنا ہوتی ہیں، وہ جوان تھی، اس کے اعضا متناسب تھے۔ کبھی کبھی نہانے وقت جب اس کی نگاہیں اپنی رانوں پر پڑتی تھیں تو وہ خود اُن کی گولائی اور گدراہٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ خوش خلق تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران شاید ہی کوئی آدمی اس سے ناخوش ہو کر گیا ہو ——— بڑی ملنسار تھی، بڑی رحمدل تھی۔ پچھلے دنوں کرسمس میں جب وہ گول پیٹھا میں رہا کرتی تھی۔ ایک نوجوان لڑکا اُس کے پاس آیا تھا۔ صبح اُٹھ کر جب اس نے دوسرے کمرے میں جا کر کھونٹی سے اپنا کوٹ اُتارا تو بٹوہ غائب پایا۔ سوگندھی کا نوکر یہ بٹوہ لے اُڑا تھا۔ بے چارہ بہت پریشان ہوا۔ چھٹیاں گزارنے کے لئے حیدر آباد سے بمبئی آیا تھا، اب اس کے پاس واپس جانے کے لیے دام نہ تھے سوگندھی نے ترس کھا کر اُسے اُس کے دس روپے واپس دے دیئے تھے ——— مجھ میں کیا بُرائی ہے؟ ، سوگندھی نے یہ سوال ہر اُس چیز سے کیا جو اُس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور سڑک کی اکھڑی ہوئی بجری ——— ان سب چیزوں کی طرف اس نے باری باری دیکھا، پھر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں جو اُس کے اُوپر جھکا ہوا تھا مگر سوگندھی کو کوئی جواب نہ ملا۔

جواب اس کے اندر موجود تھا، وہ جانتی تھی کہ وہ بُری نہیں اچھی ہے، پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی تائید کرے ——— کوئی ——— کوئی ——— اسی وقت کوئی اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ دے " سوگندھی! کون

کہنا ہے کہ تو بری ہے، جو تجھے برا کہے وہ آپ برا ہے" ـــــــ نہیں یہ کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا۔" سوگندھی تو بہت اچھی ہے!"

وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کہ کوئی اس کی تعریف کرے۔ اس سے پہلے اُسے اس بات کی اتنی شدت سے ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ آج وہ کیوں بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے اُن پر اپنے اچھے ہونے کا احساس طاری کرنا چاہتی ہے۔ اس کے جسم کا ذرہ ذرہ کیوں "ماں" بن رہا تھا۔

ـــــــ وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شے کو اپنی گود میں لینے کے لیے کیوں تیار ہو رہی تھی؟ ـــــــ اس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھمبے کے ساتھ چمٹ جائے اور اس کے سرد لوہے پر اپنے گال رکھ دے ـــــــ ـــــــ اپنے گرم گرم گال اور اُس کی ساری سردی چوس لے۔

تھوڑی دیر کے لئے اُسے ایسا محسوس ہوا کہ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور ہر وہ شے جو رات کے سناٹے میں اُس کے آس تھی ہمدردی کی نظروں سے اُسے دیکھ رہی ہے اور اس کے اوپر جھکا ہوا آسمان بھی جو مٹیالے رنگ کی ایسی موٹی چادر معلوم ہوتا تھا جس میں بے شمار سوراخ ہو رہے ہیں، اُس کی باتیں سمجھتا تھا اور سوگندھی کو بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ تاروں کا ٹمٹمانا سمجھتی ہے ـــــــ لیکن اس کے اندر یہ کیا گڑبڑ تھی؟ ـــــــ وہ کیوں اپنے اندر اُس موسم کی فضا محسوس کرتی تھی جو بارش سے پہلے دیکھنے میں آیا کرتا ہے

——— اس کا جی چاہتا تھا کہ اُس کے جسم کا ہر مسام کھل جائے اور جو کچھ اُس کے اندر اُبل رہا ہے۔ اُن کے رستے باہر نکل جائے۔ پر یہ کیسے ہو ——— کیسے ہو۔؟

سوگندھی گلی کی نکڑ پر خط ڈالنے والے لال بھبکے کے پاس کھڑی تھی ——— ہوا کے تیز جھونکے سے اس بھبکے کی آہنی زبان جو اس کے کھلے ہوئے منہ میں لٹکتی رہتی ہے، لڑکھڑائی تو سوگندھی کی نگاہیں یک بیک اُس طرف اٹھیں جدھر موٹر گئی تھی مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اُسے کتنی زبردست آرزو تھی کہ وہ موٹر ایک بار پھر آئے اور ——— اور ———

"نہ آئے ——— بلا سے ——— میں اپنی جان بیکار ہلکان کروں ——— گھر چلتے ہیں اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں۔ ان جھگڑوں میں رکھا ہی کیا ہے مفت کی دردسری ہی تو ہے ——— چل سوگندھی گھر چل ——— ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا پی اور تھوڑا سا بام مَل کر سوجا ——— فسٹ کلاس نیند آئے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا ——— سیٹھ اور اس کی موٹر کی ایسی کی تیسی ———"

یہ سوچتے ہوئے سوگندھی کا بوجھ ہلکا ہو گیا جیسے وہ کسی ٹھنڈے تالاب سے نہا دھو کر نکلی ہے۔ جس طرح پرجا کرنے کے بعد اس کا جسم ہلکا ہو جاتا تھا اُسی طرح اب بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف چلنے لگی تو خیالات کا بوجھ نہ ہونے کے باعث اُس کے قدم کئی بار لڑکھڑائے۔

اپنے مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹیس کے ساتھ پھر تمام واقعہ اُس کے دل میں اُٹھا اور درد کی طرح اُس کے رونئیں رونئیں پر چھا گیا ——— قدم پھر بوجھل ہو

گئے اور وہ اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ گھر سے بُلا کر، باہر بازار میں منہ پر روشنی کا چانٹا مار کر ایک آدمی نے اُس کی ابھی ابھی ہتک کی ہے یہ خیال آیا تو اس نے اپنی پسلیوں پر کسی کے سخت انگوٹھے محسوس کئے جیسے کوئی اُسے بھیڑ بکری کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے کہ آیا گوشت بھی ہے یا بال ہی بال ہیں ——— اُس سیٹھ نے ——— پرماتما کرے ...... سوگندھی نے چاہا کہ اس کو بد دُعا دے مگر سوچا، بد دعا دینے سے کیا بنے گا۔ مزا تو جب تھا کہ وہ سامنے ہوتا اور وہ اس کے وجود کے ہر ذرّے پر لعنتیں لکھ دیتی ——— اُس کے منہ پر کچھ ایسے الفاظ کہتی کہ زندگی بھر بے چین رہتا ——— کپڑے پھاڑ کر اُس کے سامنے ننگی ہو جاتی اور کہتی ”یہی لینے آیا تھا نا تو؟ ——— لے دام دیئے بنا لے جا اسے ——— پر جو کچھ مَیں ہوں، جو کچھ میرے اندر چھپا ہوا ہے۔ وہ تو کیا تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا ———“

انتقام کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آرہے تھے، اگر اس سیٹھ سے ایک بار ——— صرف ایک بار ——— اُس کی مڈبھیڑ ہو جائے تو وہ یہ کرے۔ نہیں، یہ نہیں یہ کرے ——— یوں اس سے انتقام لے، نہیں، یوں نہیں، یوں ——— لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سیٹھ سے اُس کا دوبارا ملنا محال ہے تو وہ اُسے ایک چھوٹی سی گالی دینے ہی پر خود کو راضی کر لیتی ——— بس صرف ایک چھوٹی سی گالی جو اس کی ناک پر چپکو مکھی کی طرح بیٹھ جائے اور ہمیشہ وہیں جمی رہے۔

•

اسی اُدھیڑ بن میں وہ دوسری منزل پر اپنی کھولی کے پاس پہنچ گئی۔ چولی میں سے

چابی نکال کر تالا کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو چابی ہوا میں گھوم کر رہ گئی! کنڈے میں تالا نہیں تھا! سوگندھی نے کواڑ اندر کی طرف دبائے تو ہلکی سی چرچراہٹ پیدا ہوئی، اندر سے کسی نے کنڈی کھولی اور دروازے نے جمائی لی۔ سوگندھی اندر داخل ہوگئی۔

مادھو مونچھوں میں ہنسا اور دروازہ بند کر کے سوگندھی سے کہنے لگا "آج تو نے میرا کہا مان ہی لیا۔ صبح کی سیر تندرستی کے لیے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ہر روز اسی طرح صبح اُٹھ کر گھومنے جایا کرے گی تو تیری ساری سُستی دور ہو جائے گی اور وہ تیری کمر کا درد بھی غائب ہو جائے گا جس کی بابت تو آئے دن شکایت کیا کرتی ہے۔
——— وکٹوریہ گارڈن تک تو ہو آئی ہو گی تو؟
——— کیوں؟"

سوگندھی نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ مادھو نے جواب کی خواہش ظاہر کی۔ دراصل جب مادھو بات کیا کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ سوگندھی ضرور اس میں حصّہ لے اور سوگندھی جب کوئی بات کیا کرتی تھی یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ مادھو اس میں حصّہ لے ——— چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی، اس لیے وہ کچھ کہہ دیا کرتے تھے۔

مادھو بید کی کرسی پر بیٹھ گیا جس کی پشت پر اس کے تیل سے چپڑے ہوئے سر نے میل کا ایک بہت بڑا دھبّہ بنا رکھا تھا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

سوگندھی پلنگ پر بیٹھ گئی اور مادھو سے کہنے لگی "میں آج تیرا انتظار کر رہی تھی۔"

_____ مادھو بڑا سپٹپایا۔ "انتظار؟
تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں آج آنے والا ہوں؟"

سوگندھی کے بھینچے ہوئے لب کھلے۔ ان پر ایک پیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی "میں نے رات تجھے سپنے میں دیکھا تھا _____ اٹھی تو کوئی نہ تھا۔ سو، جی نے کہا چلو کہیں باہر گھوم آئیں ...... اور ......"

_____ مادھو خوش ہو کر بولا۔ "اور میں آ گیا _____ بھئی بڑے لوگوں کی باتیں بڑی پکی ہوتی ہیں، کسی نے ٹھیک کہا ہے، دل کو دل سے راہ ہے _____
_____ تو نے یہ سپنا کب دیکھا تھا؟

سوگندھی نے جواب دیا۔ " چار بجے کے قریب"

مادھو کرسی پر سے اٹھ کر سوگندھی کے پاس بیٹھ گیا۔ " اور میں نے تجھے ٹھیک دو بجے سپنے میں دیکھا _____ جیسے تو پھولوں والی ساڑھی _____ ارے بالکل یہی ساڑھی پہنے میرے پاس کھڑی ہے، تیرے ہاتھوں میں _____ کیا تھا تیرے ہاتھوں میں _____ ہاں تیرے ہاتھوں میں روپوں سے بھری ہوئی تھیلی تھی۔ تو نے یہ تھیلی میری جھولی میں رکھ دی اور کہا " مادھو، تو چنتا کیوں کرتا ہے؟ _____ لے یہ تھیلی _____ ارے تیرے میرے روپے کیا دو ہیں؟" سوگندھی تیری جان کی قسم فوراً اٹھا اور ٹکٹ کٹا کر ادھر کا رخ کیا _____ کیا سناؤں بڑی پریشانی ہے! بیٹھے بٹھائے ایک کیس ہو گیا ہے۔ اب بیس تیس روپے ہوں تو _____ انسپکٹر کی مٹھی گرم کر کے چھٹکارا ملے _____ تھک تو نہیں گئی تو؟ لیٹ جائیں تیرے پیر دبا دوں۔ سیر کی عادت نہ ہو تو تھکن ہو ہی جایا کرتی ہے۔

ـــــــ ادھر میری طرف پیر کر کے لیٹ جا"ـــــــ سوگندھی لیٹ گئی۔ دونوں بانہوں کا تکیہ بنا کر وہ اُن پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور اُس لہجے میں جو اُس کا اپنا نہیں تھا۔ مادھو سے کہنے لگی "مادھو، یہ کس موئے نے تجھ پر کیس کیا ہے؟ ـــــــ جیل وہل کا ڈر ہو تو مجھ سے کہہ دے ـــــــ بیس تیس کیا سو پچاس بھی ایسے موقعوں پر پولیس کے ہاتھ میں تھما دیئے جائیں تو فائدہ ہی اپنا ہے ـــــــ جان بچی لاکھوں پائے ـــــــ بس بس اب جانے دے، تھکن کچھ زیادہ نہیں ہے۔ مٹھی چاپی چھوڑ اور مجھے ساری بات سنا ـــــــ کیس کا نام سنتے ہی میرا دل دھک دھک کرنے لگا ہے ـــــــ واپس کب جائے گا تو؟"

مادھو کو سوگندھی کے منہ سے شراب کی بُو آئی۔ اُس نے یہ موقع اچھا سمجھا اور جھٹ سے کہا "دوپہر کی گاڑی سے واپس جانا پڑے گا۔ اگر شام تک سب انسپکٹر کو سو پچاس نہ تھمائے تو...... زیادہ دینے کی ضرورت نہیں سو پچاس سے کام چل جائے گا۔"

"پچاس!" یہ کہہ کر سوگندھی بڑے آرام سے اُٹھی اور ان چار تصویروں کے پاس آہستہ آہستہ گئی جو دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ بائیں طرف سے تیسرے فریم میں مادھو کی تصویر تھی۔ بڑے بڑے پھولوں والے پردے کے آگے کرسی پر وہ دونوں رانوں پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا، پاس ہی تپائی پر دو موٹی موٹی کتابیں دھری تھیں۔ تصویر اُترواتے وقت تصویر اُتروانے کا خیال مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اس کی ہر شے تصویر سے باہر نکل نکل کر گویا پکار رہی تھی "ہمارا فوٹو اُترے گا ہمارا فوٹو اُترے گا۔"

کمرے کی طرف مادھو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوٹو اتروانے وقت اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی ۔

سوگندھی کھکھلا کر ہنس پڑی ۔ اُس کی ہنسی کچھ ایسی تیکھی اور نوکیلی تھی کہ مادھو کے سوئیاں سی چبھنے لگیں ۔ پلنگ پر سے اُٹھ کر وہ سوگندھی کے پاس گیا۔ "کس تصویر کو دیکھ کر تُو زور سے ہنسی ہے ؟"

سوگندھی نے بائیں ہاتھ کی پہلی تصویر کی طرف اشارہ کیا ۔ جو میونسپلٹی کے داروغۂ صفائی کی تھی ۔" اس کی ـــــ منتی پالٹی کے اس داروغہ کی ...... ذرا دیکھو تو اس کا تھوبڑا ۔ کہتا تھا ۔ ایک رانی مجھ پر عاشق ہو گئی تھی ـــــ اُونہہ یہ منہ اور مسور کی دال "۔ یہ کہہ کر سوگندھی نے فریم کو اس زور سے کھینچا کہ دیوار میں سے کیل بھی پلستر سمیت اکھڑ گئی ۔

مادھو کی حیرت ابھی دور نہ ہوئی تھی کہ سوگندھی نے فریم کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا ۔ دو منزلوں سے یہ فریم نیچے زمین پر گرا اور کانچ ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی .... سوگندھی نے اس جھنکار کے ساتھ کہا ۔ "رانی بھنگن کچرا اُٹھانے آئے گی تو میرے اس راجہ کو بھی ساتھ لے جائے گی !"

اس بار پھر اُسی نوکیلی اور تیکھی ہنسی کی پھوار سوگندھی کے ہونٹوں سے گرنا شروع ہوئی جیسے وہ ان پر چاقو یا چھری کی دھار تیز کر رہی ہے ۔ مادھو بڑی مشکل سے مسکرایا، پھر ہنسا ۔ ہی ہی ہی .... !

سوگندھی نے دوسرا فریم بھی نوچ لیا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا ۔ "اس سالے کا یہاں کیا مطلب ؟ ـــــ بھونڈی شکل کا کوئی آدمی یہاں نہیں رہے گا ......
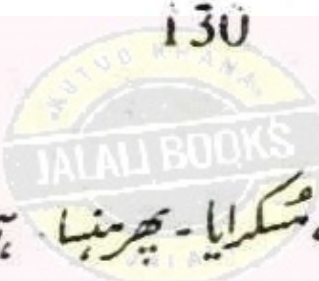
کیوں مادھو؟"

مادھو پھر بڑی مشکل سے مسکرایا۔ پھر ہنسا ہی ہی ہی.....

ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو کا فوٹو جڑا تھا۔ مادھو اپنی جگہ پر سمٹ گیا۔ جیسے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔

زور کا قہقہہ لگا کر اُس نے "اونہہ" کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیئے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اُس نے ہنس کر اتنا کہا۔ "اچھا کیا ـــــ مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھے۔"

آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ "تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا؟ ـــــ پر میں پوچھتی ہوں تجھ میں ہے ایسی کون سی چیز جو کسی کو پسند آسکتی ہے ـــــ یہ تیری پکوڑا ایسی ناک، یہ تیرا بالوں بھرا ماتھا، یہ تیرے سُوجے ہوئے نتھنے، یہ تیرے مُڑے ہوئے کان، یہ تیرے منہ کی باس، یہ تیرے بدن کا مَیل؟ ـــــ تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا، اونہہ...... پسند کیوں ہوتا تیرے عیب جو چُھپا رکھے تھے اُس نے ـــــ آج کل زمانہ ہی ایسا ہے جو عیب چُھپائے وہی بُرا۔"

مادھو پیچھے ہٹتا گیا۔ آخر جب وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا تو اس نے اپنی آواز میں زور پیدا کر کے کہا۔ "دیکھو سوگندھی، مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تُو نے پھر سے

اپنا دھندا شروع کر دیا ہے ـــ اب تجھ سے آخری بار کہتا ہوں ......"

سوگندھی نے اس سے آگے مادھو کے لہجے میں کہنا شروع کیا "اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے پھر کسی کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا ـــ اس مہینے کا خرچ مَیں تجھے پُونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا ـــ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟"

مادھو چکرا گیا .....!

سوگندھی نے کہنا شروع کیا "میں بتاتی ہوں ـــ پندرہ روپے بھاڑا ہے اس کھولی کا اور دس روپے بھاڑا ہے میرا اور جیسا تجھے معلوم ہے ڈھائی روپے دلال کے، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟ ان ساڑھے سات روپیوں میں مَیں نے ایسی چیز دینے کا وچن دیا تھا جو مَیں دے ہی نہیں سکتی تھی اور تُو ایسی چیز لینے آیا تھا جو تُو لے ہی نہیں سکتا تھا ـــ تیرا میرا ناتا ہی کیا تھا، کچھ بھی نہیں۔ بس یہ دس روپے تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے تھے۔ سو ہم دونوں نے مل کر ایسی بات کی کہ تجھے میری ضرورت ہوئی اور مجھے تیری۔ پہلے تیرے اور میرے بیچ میں دس روپے بجتے تھے آج پچاس بج رہے ہیں۔ تُو بھی ان کا بجنا سن رہا ہے مَیں بھی اُن کا بجنا سن رہی ہوں ـــ یہ تُو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے؟"

یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوپی اُنگلی سے ایک طرف اُڑا دی۔ یہ حرکت مادھو کو بہت ناگوار گزری اس نے بڑے کڑے لہجے میں کہا:

"سوگندھی!"

سوگندھی نے مادھو کی جیب سے رومال نکال کر سونگھا اور زمین پر پھینک دیا۔

"یہ چیتھڑے، یہ چندیاں — اُف کتنی بُری باس آتی ہے۔ اٹھا کر باہر پھینک ان کو......"

مادھو چلایا۔ "سوگندھی!"

سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا: "سوگندھی کے بچے تو آیا کس لئے ہے یہاں؟۔ تیری ماں رہتی ہے یہاں جو تجھے پچاس روپے دے گی؟ ! تو کوئی ایسا بڑا گبھرو جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں...... کُتے، کمینے مجھ پر رعب گانٹھتا ہے؟ میں تیری دبیل ہوں کیا؟ بھک منگے تو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے؟ میں پوچھتی ہوں تو ہے کون؟ چور یا گٹھ کترا؟ اس وقت تو میرے مکان میں کرنے کیا آیا ہے؟ بلاؤں پولیس کو، پونے میں تجھ پر کیس ہو نہ ہو یہاں تو تجھ پر ایک کیس کھڑا کر دوں......!"

مادھو سہم گیا۔ دبے ہوئے لہجے میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا: "سوگندھی، تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

تیری ماں کا سر — تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا بھاگ یہاں سے ورنہ،" سوگندھی کی بلند آواز سن کر اس کا خارش زدہ کُتا جو سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور مادھو کی طرف منہ اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔ کُتے کے بھونکنے کے ساتھ ہی سوگندھی زور زور سے ہنسنے لگی۔

مادھو ڈر گیا۔ گری ہوئی ٹوپی کو اٹھانے کے لئے وہ جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی: "خبردار — پڑی رہنے دے وہیں، تو جا، تیرے پونا پہنچتے ہی میں اس

کو منی آرڈر کر دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ اور زور سے ہنسی اور ہنستی ہنستی بید کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے خارش زدہ کُتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے نکال دیا۔۔۔۔۔ سیڑھیاں اُتار کر جب کُتا اپنی ٹُنڈ مُنڈ دُم ہلاتا سوگندھی کے پاس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑپھڑانے لگا تو سوگندھی چونکی۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا۔۔۔۔۔ ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافر اُتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے۔۔۔۔۔۔۔ یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اُس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی مگر بالکل چھلنی کا حساب تھا۔ اِدھر وہ دماغ کو پُر کرتی تھی اُدھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اُس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کُتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔

توازن

پولیس ہیڈ آفس کے پچھواڑے والی عمارت کے بڑے کمرے میں خاصی چہل پہل دکھائی رہی تھی۔ آج چٹھی رسانوں کے علاقے بدلے گئے تھے۔ چٹھی رساں گلاب دین کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ کرم الٰہی نے اکرام سے پوچھا "گلاب دین کی ماں کیوں مری ہوئی ہے؟"

"اس کی بدلی ہیرا منڈی ہو گئی ہے۔"

کرم الٰہی نے ہاتھ آگے کرتے ہوئے کہا: "سوں رب دی۔"

اکرام بولا: "سوں رب دی۔" اور اس نے بھانڈ کی چپڑاس کی طرح اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر دے مارا۔ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"اس کا کیا مطلب ہوا جی! رزق دینے والا تو خدا ہوتا ہے۔ مجھے خواہ نوکری کیوں نہ چھوڑنی پڑے، میں بڑے صاحب کے پاس اپیل کروں گا۔ آپ خود سمجھ دار ہیں۔ افسروں کو کچھ تو خیال کرنا چاہیئے کہ کون سا علاقہ کس کو دینا چاہیئے۔" گلاب دین اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

وہ پانچ وقت کا نمازی تھا۔ اپنے محلے میں تراویح کی نمازوں میں قرآن خوانی کا انتظام کرنا ہمیشہ اسی کے ذمے ہوتا تھا۔ بازار میں معراج شریف کا چندہ اسی کے ایما
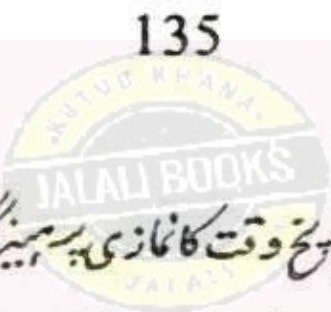
"تو پھر؟"

"جی ذرا خیال فرمایئے، میں پانچ وقت کا نمازی پرہیزگار آدمی ہوں۔ میری بڑی بےعزتی ہو گی۔" اُس نے درخواست نکال کر میز پر رکھ دی اور اپنے خاکی کوٹ کی جیب سے کالے دانوں کی تسبیح نکال کر بولا۔ "حضور! جس ہاتھ سے یہ تسبیح پھیری جاتی ہے، وہ بدکاری کے اڈوں میں جاکر پیشہ ور عورتوں کو خط تقسیم کرے گا؟ استغفراللہ۔ مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا جناب! میری گذارش ہے کہ مجھے فیض باغ کا علاقہ دے دیا جائے یا مصری شاہ میں رہنے دیا جائے۔"

پوسٹ ماسٹر نے پیپر ویٹ ہاتھ میں گھماتے ہوئے کہا۔ "تو تمہاری تبدیلی منسوخ کر دی جائے؟"

"آپ کے بچے جیتے رہیں۔ یہی کمترین کا مطلب تھا۔"

"سردست یہ مشکل ہے۔ غور کرنے کے لیے تمہاری عرضی رکھے لیتے ہیں۔ مگر اس وقت تبدیلی منسوخ نہیں ہو سکتی۔" گلاب دین کے سینے میں ایک تیر سا لگا۔

سراج اور گلاب دین دونوں چھتی رساں پانی والے تالاب سے ہوتے ہوئے جب نوگزے کی قبر پر پہنچے تو سراج رُک گیا۔ اُس نے ہاتھ میں تھامی ہوئی ڈاک چھانٹی اور بولا۔ "مولوی گلاب دین! آ ادھر سے شروع کریں۔" وہ دائیں ہاتھ کو نکڑ مڑ گیا۔ "یہ پہلا چوبارہ فیروزاں کا ہے۔ اِدھر سب گانے والیاں رہتی ہیں۔" پھاٹک کے سامنے چارپائی بچھائے تین چار آدمی بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ مکان کے پختہ چھجے پر ایک عورت کندھے پر تولیا ڈالے گیلے بال انگلیوں سے جھٹکے دے دے کر سکھا رہی تھی۔ دوپٹہ نہ ہونے کی وجہ سے گلاب دین کو وہ بہت بے شرم دکھائی دی۔ پھر

سے اکٹھا ہوتا اور اُسی کے ہاتھوں سے خرچ ہوتا تھا۔ میلادالنبیؐ کے جلوس پر محلے کے لڑکے بالے اُسی کی ہدایت کے مطابق خوب صورت محراب نما دروازے بناتے اور جھنڈیاں لگاتے تھے۔ مسجد کے باقاعدہ نمازیوں میں اُس کا شمار تھا۔ اُسے دیندار لوگوں کی صحبت سے، مسلے مسائل سے بھی خاصی آگاہی ہو چکی تھی۔ فرض شناسی اور ایمان داری کی بنا پر اپنے پرائے سبھی اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے مگر آج اُس کی عزت کا دم گھُٹ رہا تھا۔ تُو ہیرامنڈی میں خط بانٹنے جائے گا۔ طوائفوں کے کوٹھوں پر چڑھ کر آواز دے گا۔ بی بی خط آیا، غلیظ گلیوں میں جاکر بیٹھے دروں کو اُن کے یاروں کے خط دے گا جو ہوس سے شروع ہو کر ہوس ہی پر ختم ہوں گے۔ جن کا مضمون صرف بدکاری ہوگا کسی خط میں ماں کی مامتا نہ ہوگی۔ کسی خط میں باپ کا پیار نہ ہوگا۔ ماں کی چھاتیوں میں دودھ کی جگہ سنکھیا ہوگا اور باپ کی نگاہوں میں بے غیرتی، بے حیائی، وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔

اگلے دن پوسٹ ماسٹر کہہ رہا تھا "گلاب دین کیوں پیش ہونا چاہتا ہے؟"

سپروائزر بولا "آپ سے کوئی درخواست کرنا چاہتا ہے۔ صرف دو منٹ کے لئے پیش ہونے کو کہہ رہا ہے۔"

"بلاؤ"

گلاب دین کا چہرہ بڑے صاحب کی پیشی میں زرد پڑ رہا تھا۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔ کترے ہوئے لب زیادہ موٹے دکھائی دے رہے تھے۔ داڑھی کے بال زیادہ گھنے نظر آ رہے تھے۔ وہ شاید تازہ تازہ وضو کر کے دعا مانگ کر آیا تھا۔ "کیا بات ہے گلاب دین؟"

"جی میں صرف یہ عرض کرنے کو پیش ہوا ہوں کہ میری تبدیلی ہیرامنڈی میں کر دی گئی ہے......"

جھٹکے کے ساتھ اس کا سینہ .... اُس کا جی چاہا ، وہ آنکھیں بند کر لے ۔ اُس نے اپنی پگڑی کا شملہ پکڑ کر ناک اور منہ چھپا لیا ۔ "کل سے میری جگہ یہ چٹھیاں تقسیم کیا کریں گے ۔"

" یہیں نیا چٹھی رساں لگ گیا ؟"

" جی ہاں ۔"

لمبی لمبی مونچھوں والے نے تاش کے پتے پٹاخ سے بند کرتے ہوئے پہلے سراج کو دیکھا اور پھر گلاب دین کو طرف نگاہ پھرائی ، دیکھنے والے کی آنکھیں سرخ تھیں اور چارپائی کا کافی حصّہ اُس کے بھاری جُثّے نے گھیرا ہوا تھا ۔ اُس نے گھٹنا اُٹھا کر لٹھے کی چادر جڈوں میں دے لی پھر آسودگی سے بیٹھ گیا ۔ اُس کی پنڈلیوں پر منڈھے ہوئے بالوں کا کھردرا غبار پھیلا ہوا تھا ۔ "منشی ہوراں کا نام کیا ہے ؟" نوجوان چھوکرے نے پوچھا ۔

سراج نے جواب دیا ۔ "گلاب دین ۔"

نوجوان چھوکرے نے ہنس کر کہا ۔ " او رانجھا بُجل گلاب دا میری جھعلی ٹٹ پیا ۔"

" وے شرم نہیں آتی تجھے ۔ سلام دعا کی بجائے الٹا مسخریاں کرنے لگا ۔" تجاوز پر کھڑی ہوئی طوائف نے جھڑکا ۔ اس نے اپنا ایک پاؤں کٹہرے پر اُٹھا رکھا تھا جس سے اُس کی وزنی رانوں کا اندازہ لگانے میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی تھی ۔

" او بی بی ! اپنی شلوار جا کے سیوں پہلے ۔"

اس نے اپنا پاؤں کٹہرے سے نیچے رکھ لیا اور بولی ۔ " فٹے منہ بے شرما ۔"

مونچھوں والے نے ڈبیا اُٹھا کر گلاب دین سے کہا ۔ " سگریٹ پیو مولبی جی ۔"
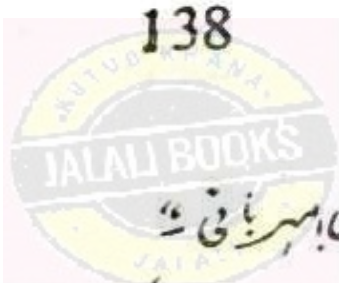
گلاب دین بولا "نہیں جی! مہربانی "

سراج نے سگریٹ سلگا لیا اور سلام علیکم کر کے آگے چل دیا۔

"یہ مونچھوں والا کون ہے ؟"

"اس گلی کا چودھری!"

"اور وہ لمبر سا چھوکرا ؟"

"یہ بلّو کے چاچے کا لڑکا ہے۔ یہ بلّو ہی تو تھی۔ ڈھولک کے گیت بہت اچھے گاتی ہے۔ یہ نچلی بیٹھک بالاں کی ہے اور اوپر چوبارے میں گنگ رہتی ہے" اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ڈاک سے ایک لفافہ نکال کر گلاب دین کو دکھایا جس پر سرنامے میں لکھا تھا:

"زمرد سلطانہ عرف گنگ"

وہ سیڑھیاں چڑھ کے گلیارے میں آ پہنچے۔ بیٹھک خالی پڑی تھی۔ دروازے پر موتیوں سے پروئی ہوئی لڑیاں آپ ہی آپ لرز رہی تھیں۔ سراج نے میلی میلی چاندنی پر خط پھینکتے ہوئے کہا۔

"چٹھی لے لو جی"

ایک ٹھگنی سی عورت نے خط اٹھا لیا۔ سراج بولا

"بی بی جی۔ کل سے یہ چٹھی رساں چٹھیاں بانٹا کریں گے"

"اچھا منشی!" اس نے بے دھیانی میں کہا اور اضطراب سے لفافہ دیکھتی ہوئی اندر چلی گئی "گنگ جی، چٹھی آئی ہے"

واڑی پر تاش کھیلنے والوں کے پاس سے گزرتے وقت گلاب دین نے اپنی خالی خالی نگاہیں ہوا میں ڈال دیں تاکہ وہ پھر سارڈ کا اُسے پھر مذاق سے کچھ کہہ نہ دے مگر اُن لوگوں نے اب دیکھا بھی نہیں کہ کون گزر گیا۔ بازار میں پہنچ کر گلاب دین نے ایک لمبی سانس لی اور شملے کے سرے سے ماتھا پونچھا۔" یہ نکا پان والا ہے۔ یہ شہابے کی دکان ہے۔ شہابے کے پان ساری ہیرا منڈی میں مشہور ہیں۔ یہ اُس کا شاگرد ہے، دن کو یہ بیٹھتا ہے۔ شہابا اس وقت سو رہا ہوگا، شام کو بیٹھے گا۔ پان سگریٹ کی دکانیں دلالی کے اڈے ہیں مولوی جی!"

اس وقت تک گلاب دین کو چپ لگی ہوئی تھی۔ وہ سراج کے لہجے براہ راست خطاب پر چونک پڑا۔ بولا" خدا غارت کرے ان لوگوں کو!"

" بازار میں یہ لوگ جو تم کو اس وقت دکانوں پر بیٹھے نظر آرہے ہیں، طوائفوں کے ملازم ہیں" ایک گلی کے سرے پر کھڑے ہو کر سراج چٹھی رساں نے خط پھر چھانٹے۔" اس گلی میں پیشہ کمانے والی بیٹھتی ہیں"۔ سراج نے کسی جذبے کے بغیر کورے گائیڈ کی طرح کہا اور گلاب دین کو لے کر آگے بڑھ گیا۔

اس گلی میں سڑے ہوئے خربوزوں کی بو آرہی تھی۔ گلاب دین نے شملے سے پھر اپنا منہ ڈھک لیا۔ عاجزی سے بولا" اس گلی میں جانا ضروری ہے؟"

" صرف ایک خط ہے"

" کس کا؟"

" کنجروں کے چودھری حاتو کا۔ اس گلی کی بہت کم چھٹیاں ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ہوتی ہے تو وہ چودھری کی یا کسی دلال کی ہوتی ہے"

چودھری کی خضاب لگی داڑھی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور ایک شخص اُس کی پنڈلیاں سُوت رہا تھا۔ قریب ہی ایک تیل مالشیا بیٹھا تھا۔ "کدھر ماسٹر؟" اس نے چٹھی رساں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"چودھری جی! آپ کی یہ چٹھی تھی۔"

کسبیاں اپنی اپنی دہلیزوں پر لوہے کی کرسیاں رکھے بیٹھی تھیں۔ چہروں پر پھٹکار برس رہی تھی۔ گلاب دین نظریں نیچی کئے سراج کے ساتھ ساتھ گزر رہا تھا۔ اتنے میں کسی عورت کی آواز آئی "میاں مٹھو! چوری کھانی ہے" گلاب دین نے چور آنکھ سے دیکھا۔ ایک کسبی نے اپنے دروازے پر طوطے کا پنجرہ لٹکا رکھا تھا۔ چٹھی رساں کو دیکھ کے بولی: "منشی جی! ہماری کوئی چٹھی نہیں آئی؟" سراج نے نفی میں سر ہلایا تو بولی "ہائے ہمیں کوئی چٹھی نہیں لکھتا"

ایک دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ دوپٹہ اتارے سینہ اکڑائے ایک عورت کھڑی تھی بولی "یاروں پٹنی! اب تجھے کون چٹھی لکھے گا۔ مر گئے تیرے سب یار چٹھیاں لکھنے والے"

یہ دونوں آگے نکل گئے۔ سراج نے کہا "طوطے والی عورت کا نام گلابو ہے۔ اس گلی کی ساری رونق اُسی کے دم سے ہے۔ بہت سے تماش بین اس گلی میں اُسی کی خاطر آتے ہیں" گلی آگے سے تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ تماش بین جو چھدرے چھدرے دکھائی دیتے تھے اب ان کی وجہ سے راستہ رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ گلاب دین کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے کھلی سڑک پر پہنچ کر اطمینان کی سانس لی۔ پگڑی کے شملے سے ماتھا پونچھا اور داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے وقت اُسے یاد آیا کہ اُس نے تماش بینوں کے ریلے میں ایک داڑھی والے کو بھی دیکھا تھا جس نے ماتھے پر ہار لپیٹا ہوا تھا اور پھر گجرولا

کے چودھری کی خضاب لگی رنگین بھرویں داڑھی اُسے یاد آئی ۔ وہ تھک چکا تھا اور اپنے کام سے بیزاری محسوس کر رہا تھا ۔ اُس نے سوچا ، کاش اُس کی نرن تیل کی دُکان ہوتی آرام سے بیٹھا دُکان کرتا ۔ اسے معلوم نہیں تانگوں کے اڈے تک پہنچنے میں کتنا وقت لگا ۔ سینما کے قریب کا ماحول اُسے کچھ مختلف لگا ۔ اُس کا جی چاہا ، سیڑھیوں پر بیٹھ کر آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہے تاکہ اُس کے اعصاب سے کھنچاؤ دور ہو جائے

سراج نے اس کی طرف دیکھ کر کہا ۔ "کیوں منشی جی ! تھک گئے ؟"

"نہیں تو ۔"

"بس یہ دو چار چٹھیاں اور بانٹنی ہے ۔"

یہ کہہ کر سراج نے چار پانچ خط گلاب دین کو تھما دیئے ۔ گلاب دین کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے غلیظ خون سے بھرے لتے کرڑے کے ڈھیر سے اٹھا کر اُس کے بازو ہاتھوں میں تھما دیئے ہوں ۔ اتنے میں سراج ایک مکان میں داخل ہو گیا ۔ مکان کی ڈیوڑھی بہت بڑی تھی جو نہائی پڑی تھی ۔ وہ بے دھڑک آگے صحن تک بڑھ گیا ۔ صحن میں ایک طرف نواڑی پلنگ پر دو نوجوان لڑکیاں بیٹھی لہسن کی تُریاں چھیل رہی تھیں ۔ سامنے لہسن کے چھلکوں کا ڈھیر لگا تھا ۔ زمین پر چیڑ کی بچھائے ایک چھوٹی سی لڑکی الگ بیٹھی لہسن چھیل رہی تھی ۔ سراج نے گلاب دین کے کان میں کہا ۔ "یہ بدرو اور قمرو کا مکان ہے ۔" اور گلاب دین کے ہاتھ میں تھمی ہوئی ڈاک سے ایک خط نکال لیا جس پر بدر النساء کا نام لکھا ہوا تھا ۔ ان کی آواز سن کر دونوں لڑکیوں نے نگاہیں اوپر اٹھائیں ۔ سراج بولا ۔ "خط آیا جی !"

دونوں لڑکیاں بے تابی سے آگے بڑھیں ۔ سراج نے خط دینے کے لئے گلاب دین

کو آگے دھکیلا ۔ یہ پہلا خط تھا جو گلاب دین نے دیا ۔ بدرالنسا خط کھول کر پڑھ رہی تھی کہ ڈیوڑھی میں سے دو بھاری بھر کم آدمی داخل ہوئے ۔ سراج بولا "لو استاد بوری بھی آگئے ۔ منشی جی ! استاد نورالدین کی چٹھی دیکھنا "

گلاب دین خط چھانٹنے لگا ۔ بدرالنسا خوشی سے چلائی "آپا کے کاکی ہوئی " دونوں لڑکیاں بدرالنسا کے پیچھے بھاگ گئیں ۔

استاد نورالدین صحن میں کھڑا کہہ رہا تھا "او حیوانو ! شیطانو ! ہمیں چٹھی تو دکھاؤ "

برآمدے میں لٹکی چق کے پیچھے سے کسی معمر عورت کی آواز آئی "استاد جی ! قمر کے کاکی ہوئی ہے "

"نصیبوں والی ہو ، مبارکاں ہوں اماں جی !"

"آپ کو بھی ہوں ، اری لڑکیوں ! چٹھی رساں کا منہ تو میٹھا کرا دو "

استاد بولا "ایک چٹھی رساں نہیں دو ہیں "

سراج مسکرا کر بولا "استاد جی ! آپ بڑے جگتی ہیں ۔ اپنا خط بھی لیا کہ نہیں ؟"

گلاب دین نے نورالدین کو اس کا خط دے دیا جو محض اشارہ پانے کا منتظر کھڑا تھا

دوسرا بھاری بھر کم آدمی بولا "آج آپ ....."

سراج نے کہا "آج میرا آخری دن ہے ۔ کل سے منشی گلاب دین چٹھیاں بانٹا کریں گے "

سراج کے ہاتھ میں قدردانوں نے آکر دو روپے دے دیئے ۔ استاد نے گلاب دین کی طرف دیکھ کر جگت کی "بڑی قسمتوں والے ہو ۔ کنجروں کے گھر سے پہلے
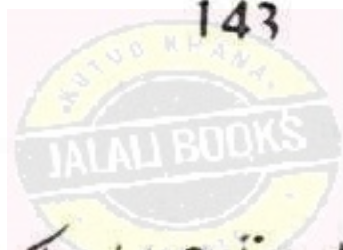
ہی دن بوہنی کر چلے ہو۔"

بدر دبولی۔"مسخریاں چھوڑ و استاد جی! باہر جا کر اپنے بوریوں کو دیکھو اور کہو گھر مٹھائی کی ٹوکری لے کر آئیں۔"

بازار میں پہنچ کر سراج نے لوہے کے جنگلے والے مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہاں بیگماں رہتی ہے۔ وہ سامنے والا مکان بھوکا ہے۔۔ اس کے پیچھے وہ جو بیٹھک نظر آتی ہے وہ استاد نورالدین کی بیٹھک ہے۔ اُسے بدرنگے کی بیٹھک بھی کہتے ہیں دیکھا تو ایک۔ چٹھی منتری کی بھی تھی؟"

گلاب دین نے ڈاک دیکھ کر کہا۔"ہاں۔"

یہ گھر زہرہ منتری کا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ سامنے برآمدے میں ایک عورت چارپائی پر کروٹ بدلے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے مرتے ہوئے کولہوں سے قمیص ہٹی ہوئی تھی قدموں کی چاپ سن کر بھی اس نے اس طرف نہ دیکھا جیسے وہ کوئی نشہ پی کر بے سدھ پڑی ہو۔ سراج نے کھانس کر کہا "چٹھی رساں آیا۔"

ساتھ والے کمرے سے ایک نازک سی دبلی پتلی لڑکی خط لینے کے لیے نکل آئی۔ سامنے والے کمرے میں دو سازندے بیٹھے ایک چھوٹی سی لڑکی کو سبق دے رہے تھے۔ جس نے ناک میں نتھنی پہن رکھی تھی، ہاتھ کان کے پاس رکھے لمبی آواز میں کہتی جا رہی تھی "—— آ——" اُسی طرح پھر کہے جا رہی تھی "——جا——"

نئے بازار میں آ کر سراج نے دوبارہ گلاب دین کو ایک روپیہ دینے کی کوشش کی۔ دونوں روپے خود رکھ لینا اُسے اچھا نہ لگتا تھا۔ اُس نے ایک روپیہ زبردستی اُس کے کوٹ کی جیب میں ڈال دیا اور بولا "بزرگو! یہ کوئی حرام کا پیسہ نہیں ہے

سمجھنے کی بات ہے۔ کسی کی جیب سے روپیہ نکال لینا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ روپے کا تو یہی حساب کتاب ہے۔ آج یہ ہماری جیب میں، کل دوسرے کی جیب میں، پرسوں وہاں سے تیسرے کے پاس۔ کسی کے پاس کب ٹھہرتا ہے؟"

گلاب دین کو وہ ننھی والی لڑکی یاد آگئی جسے پہلا سبق یہی دیا جا رہا تھا ـــ آ ـــ جا ـــ پھر آ ـــ پھر جا ـــ" یہ اب کدھر کو؟" گلاب دین نے سراج کو اب ایک تیسری گلی میں جاتے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

ہمیں کسی بھڑدے کا ڈر ہے منشی جی! ہم اپنی ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ اس طرح تو آپ بھر جائے"

اُس گلی میں پکے گوشت کی بساندھ آرہی تھی جیسے بیف مارکیٹ سے آتی ہے دو رویہ کرسیوں پر پیشہ ور عورتیں مردوں کی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑی بے باکانہ بیٹھی تھیں۔ ان کی باتیں بیہودہ اور حرکتیں بڑی لچر تھیں۔ کچھ اور چوباروں پر بیٹھی تاک جھانک کر رہی تھیں۔ سراج بولا" یہاں سب درڑ مال ہے"

نصف گلی میں پہنچ کر اُس نے کہا" منشی جی! فضل دین معرفت الٰہی جان کا خط نکالنا، اسے دے دو"

گلاب دین نے اس پتے کا خط الٰہی جان کو دے دیا جس کے پاس سے اُسے نسوار کی بو آئی۔ ایک دروازے کے سامنے بہت سے تماش بین ایک مشکی رنگ کی عورت سے چہلیں کر رہے تھے۔ جس نے تہمد باندھ رکھا تھا، کانوں میں موتیے کے پھول تھے اور بالوں میں سرخ گلاب اُڑس رکھا تھا۔ سراج نے یہ کہہ کر علاقے کے باخبر چٹھی رساں ہونے کا مظاہرہ کیا۔" یہ خانگی ذات کی مستن ہے"

اس وقت گلاب دین کو یہ بات اچھی نہ لگی ۔ باہر نکلتے ہی اُس نے ہڑبڑا کر پوچھا ۔

"ان خانگیوں کی تعداد کتنی ہو گی ؟"

"کوئی گنتی شمار نہیں ۔ خانگیاں نہیں کہتے انہیں مولوی جی ! یہ کنجریاں ہیں نئی پیشہ بیٹھنے والی کو خانگی کہتے ہیں ۔" خرک ۔ گلاب دین نے حلق کھرچ کر زور سے تھوکا ۔

ڈاک تقسیم کرنے کے دو وقت تھے ۔ ایک دوپہر ، ایک سہ پہر ۔ دونوں وقت گلاب دین کو علاقہ گھومنا پڑتا ۔ چاروں طرف چٹھیاں بانٹنے جانا پڑتا ۔ اس بات کا اُسے بڑا افسوس تھا کہ وہ بدرو قدرو کے گھر سے لیا ہوا روپیہ واپس نہ دے سکا ۔ اس روز سراج نے روپیہ زبردستی اُس کی جیب میں ڈال دیا تھا کہ اُس سے اُسے اسی طرح اعنت رہتے دیا کہ اگلے روز جا کر واپس دے دے گا ۔ مگر اُسے اُدھر جانے کا حوصلہ نہ پڑا ۔ اُس نے سوچا کسی روز اُن کی چٹھی دینے جائے گا تو روپیہ بھی واپس کر دے گا مگر چٹھی ہی نہ آئی ۔ جس دن آئی ، اُس سے دو روز پہلے اُس کی جیب سے وہ روپیہ نکال کر اُس کی بیوی نے مٹی کا تیل منگا لیا تھا ۔

بدرو اور قدرو سفید چاندنی پر لیٹی ہوئی تھیں ۔ گاؤ تکیے پر اُن کی چھوٹی بہن آلتی پالتی مار کر بیٹھی ہوئی تھی ۔ جو آج اپنی عمر سے بڑی دکھائی دے رہی تھی ۔ پاس اُن کا باپ بیٹھا حُقّہ پی رہا تھا ۔ جب گلاب دین صحن میں داخل ہوا تو بدرو اُسے دیکھتے ہی بولی ۔ "چٹھی رساں آیا ۔"

گلاب دین نے ڈاک چھانٹ کر تین لفافے اُسے پکڑا دیئے ۔ اس کا باپ بولا "آؤ منشی جی ! جی آیاں نوں ، لڑکیاں روز کہتی تھیں ، چٹھی نہیں آئی ۔ نئے منشی جی لگے ہیں ۔ کہیں ہماری چٹھیاں دوسری جگہ نہ دے دیں ۔"

گلاب دین بولا "جی نہیں، آپ کی چٹھی نہیں آئی تھی۔"

"میری بات کا خیال نہ کریں آدمی بندہ بشر ہے، غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ بازار میں میری لڑکیاں بدرو اور قدرو کے نام سے مشہور ہیں، اصل نام بدرالنسا اور قدرالنسا ہے۔ تیسری قمرالنسا کراچی میں بیٹھک کرتی ہے۔"

قدرالنسا چاندنی پر لیٹی لیٹی بولی "ابا بھی تو اس روز کاکی کے پیدا ہونے کی چٹھی لائے تھے۔

"بڑے مبارک قدم ہیں آپ منشی جی! خدا آپ کا بھلا کرے۔ یہ منی آرڈر تو رکھ دیں۔" اس نے گاؤ تکیے کے پیچھے سے ایک منی آرڈر فارم اٹھا کر گلاب دین کے ہاتھ میں دے دیا، بیٹھنے کے لئے جگہ خالی کر دی اور حقہ اس کی طرف موڑ کر تو کر سے کہنے لگا۔ "او منشی جی کے لیے لسی لا۔"

"جی نہیں تکلیف نہ کریں۔"

"تکلیف کس بات کی بھئی! گھر کی لسی ہے۔"

"کوئی لویرا ہے؟"

"بھینس ہے منشی جی!"

بدرالنسا بولی۔ "ہمارا گھرانا تو مغلوں کے وقت سے آباد ہے۔"

گلاب دین کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ بدرو کا باپ بولا "ہم کوئی ایسے ویسے نہیں، بڑے خاندانی کنجر ہیں۔" پھر اس نے قمرالنسا کے نام منی آرڈر لکھنا شروع کر دیا۔ جب آخری خانہ آیا تو بولا "یہ دو سو روپیہ تمہیں کاکی کی چھٹی کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔ تمہاری ماں کی طبیعت اچھی نہیں۔ جونہی اچھی ہوئی، تمہیں ملنے کے لیے آ

جائے گی۔

تسلی کے شکریے کے طور پر گلاب دین نے پوچھ لیا۔ "کیا تکلیف ہے گھر میں؟"

"چکہ آتے ہیں۔ ہم لوگ پرہیز بھی تو نہیں کرتے نا منشی جی!"

گلاب دین چلنے لگا تو بدرو کا باپ بولا۔ "منشی جی! جس روز گھر کی لسی پینے کو جی چاہے بلا تکلف چلے آیا کریں۔"

آہستہ آہستہ گلاب دین کو سب کے اندرون خانہ کا حال معلوم ہو گیا مثلاً یہ گیروے رنگ کا کشادہ مکان جس میں بدرو اور قدرو رہتی تھیں، اُن کی پردادی کو ایک رئیس لالہ مکند لال نے بنوا کر دیا تھا اور یہ کہ اب وہ سب سے چھوٹی لڑکی مہر النسا کے لیے کسی اچھے رئیس کی تاک میں تھے۔ پرلے روز قدرو کو جب مجرے کے لیے گلبرگ جانا تھا تو بدرو نے مہر النسا کو کس کس طرح سجایا تھا اور وہ بقول اُن کے نتھنی پہنے ہوئے موتی گڑیا دکھائی دیتی تھی۔ بدرو اور قدرو کے باپ کا نام عبدالکریم تھا اور بھائی کا نام قیم تھا جو کانوں میں مندراں پہنے رہتا، اچھا کھاتا، اچھا پہنتا تھا ور کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ بدرو اور قدرو کی ماں سخت پردہ کرتی تھی۔

زہرہ و مشتری کے گھر موٹے موٹے کولہوں والی عورت جو کروٹ بدلے لیٹی نظر آتی تھی، وہ زہرہ و مشتری کی سوتیلی بہن ہے جسے افیون کھانے کی علت ہے۔ اسی طرح گولی کھا کر لیٹ جاتی ہے۔ زہرہ و مشتری کی ماں پردہ کرتی ہے اور پچھلے سال حج کرنے گئی تھی۔ اُس کی دیکھا دیکھی گھر والوں کے سامنے بدرو اور قدرو کی ماں بھی حج کرنے کی خواہش کا اظہار کرتی رہتی ہے مگر عبدالکریم اور اس کی تینوں بیٹیاں اسے لیے حامی نہیں بھرتیں کہ ماں کی صحت کمزور ہے۔

گلاب دین کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس گانے والی کی بیٹھک زیادہ چمکے، دوسرے کے گھر فوراً خبر پہنچ جاتی ہے کہ فلاں کے ہاں آج کل زیادہ سوسائٹیاں آتی ہیں۔ یہ سب کام طوائفوں کے ملازم کرتے ہیں جو رات بھر اِدھر اُدھر پھرتے رہتے ہیں، دن بھر دکانوں پر بیٹھے تاش کھیلتے ہیں اور سہارتے والوں سے پیڑے کی لسیاں پیتے ہیں۔ جن جن مکانوں کے دروازوں پر دن کو موٹی موٹی چقیں اور تہہ دار ٹاٹ لٹکے رہتے ہیں، رات کو انہی مکانوں کے دروازے اس زور سے کھلتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے، چق اور ٹاٹ کی دھجیاں اُڑ گئی ہیں۔ ایسے یہ سب مکان پُراسرار نظر آتے تھے۔

وہ ایک دن تھکا ہوا تھا۔ پیاس لگی ہوئی تھی۔ اُس کا جی عبدالکریم کے گھر لسی پینے کو چاہا۔ اُس نے سوچا، یہ چار چٹھیاں بانٹ کر چوک کی طرف مڑ جائے گا۔ جوں ہی وہ چار چٹھیاں بانٹنے گلی میں داخل ہوا، وہاں شور مچا ہوا تھا۔ مسلن کی ایک رنڈی سے لڑائی ہو رہی تھی اور چند رنڈیاں کھڑی تماشا دیکھ رہی تھیں۔ جب گلاب دین وہاں سے گزرنے لگا تو مسلن اپنی مخالف رنڈی کی طرف لچر سا اشارہ کر کے بولی "جانی تجھے چٹھی رساں"

"جانی گشتیے تجھے چٹھی رساں" دوسری نے پلٹ کر جواب دیا۔

سب رنڈیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور گلاب دین چٹھیاں بانٹے بغیر گلی سے نکل آیا اور عبدالکریم کے پاس پہنچا۔ وہ اپنی ڈیوڑھی میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ "خیر ہے؟ آپ کچھ گھبرائے ہوئے ہیں" گلاب دین نے پگڑی کے شملے سے ماتھا پونچھا اور سارا واقعہ بیان کر دیا۔

عبدالکریم اگلے روز گلاب دین کو چودھری حاتو کے پاس لے گیا جس نے اللہ رکھی

مستری کو خوب پیٹا اور گلاب دین سے کہنے لگا "دیکھو منشی جی! آپ نے مجھے یہ تو نہیں بتایا تاکہ گلابو کی گلی سے گزرتے وقت پھونداں کنجری آپ کو ٹچکیں کیا کرتی تھی۔ جب آپ گزرتے، وہ گلابو سے کہتی، نی تیرا خصم غلاب دین آیا ای۔ مجھے یہ شکایت دوسری رنڈیوں سے ملی تھی اور رئیس نے ایک دن اس بات پر پھونداں کی پسلیاں بھی توڑی تھیں۔ ہمیں تو آپ کا پہلے ہی بڑا خیال ہے منشی جی! مگر ایک بات آپ سے کہنی ہے مجھے، وہ یہ کہ آپ ان گلیوں سے مردوں کی طرح گزرا کریں کھسروں کی طرح نہیں۔ اس علاقے میں تو آدمی کو بڑا اُستر اگل ہو کر رہنا چاہیئے"۔

جب گلاب دین عبدالکریم کے ساتھ اس کے گھر پہنچا تو ڈیوڑھی سے باہر ایک لمبی سی سبز کار کھڑی دیکھ کر عبدالکریم بولا "میرا خیال ہے، رانا ہوری آئے ہیں"۔

بیٹھک میں خستہ صوفے پر جس کا غلاف پرانی میل سے موم جامہ بن چکا تھا، رانا صاحب بیٹھے تھے۔ صوفے کے بازو پر بدرو بیٹھی تھی اور مہردا ایرانی سلک کا تھان اپنے بازوؤں سے ناپ رہی تھی۔ پھیلے ہوئے بازوؤں سے اُس کے سینے کی گوری گولائیاں سامنے آکر آنکھیں لڑا رہی تھیں۔ رانا سے ہاتھ ملا کر عبدالکریم گاؤ تکئے پر بیٹھ گیا اور مہرد سے بولا "گجے سے کہو، منشی جی کو لسی پلائے"۔

بدرو بولی "وہ بازار گیا ہے، میں جاتی ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ صوفے کے بازو سے اُٹھ بیٹھی اور اندر سے لسی کا ایک گلاس لا کر اس نے گلاب دین کے ہاتھ میں دے دیا اور پُراسرار طریقے سے آہستہ سے بولی "آپ ابھی جائیں مت"۔

وہ وہاں سے اپنی ریشمی شلوار ہاتھوں میں سنبھالتی ٹاپ کر برآمدے میں پہنچی اور وہاں سے بیٹھک میں آکر رانا سے بولی "اماں ہوری اندر بیٹھے بھینس کا سودا کر رہے

ہیں۔" پھر باپ کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ "اماں جی کہتے ہیں، بھینس کا مالک کہتا ہے۔ لینا ہے تو دو دن میں آکر اپنا مال لے جائیں۔"

باپ نے مسکرا کر رانا کی طرف دیکھا اور بولا۔ "یہ دونوں بہنیں باری باری لسّی رڑکتی ہیں (بلوتی ہے) اصل میں رانا جی! اب ہماری بھینس سوکھ گئی ہے۔ مجھے روز کہتی تھیں، ابا نئی لے دو۔"

رانا بھینی سی نگاہیں بدرو کے چہرے پر ڈال کر بولا۔ "تو لے لو نا، کتنے ہیں دینا ہے؟"

"کہیں ابا جی! آٹھ سو مانگتا ہے؟"

"ہاں پُتّر۔"

"کل مجھ سے چیک لے لینا۔" رانا بے غرضی سے بولا۔

بدرو نے چونچال پن سے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔ "اچھا منشی جی! آپ اب جائیں۔ ڈوگر سے کہہ دیں، ابا جی آکر بھینس لے جائیں گے۔" بھینس؟ کیسی بھینس؟؟ وہ سوچنے لگا۔

اُس نے باہر نکلتے ہی پنواڑی سے پوچھا۔ "یہ رانا بوری کون ہیں؟"

"جس نے بدرو کو سرفراز کیا تھا اس کا بٹی ہے۔ کوئٹہ سے آیا ہے۔ بھولے نہ بنو منشی جی! مال لایا ہوگا۔ اب چھوٹی بھی جوان ہو گئی ہے۔ بڑا اُستزا گل آدمی ہے۔" اُستزا گل کیا ہوتا ہے۔ یہ سوچتا ہوا وہ لوگزے کی قبر کی طرف چل دیا۔

اگلے روز اُسے رانا کو دیکھنے کا شوق پھر بدرو کے گھر لے گیا۔ بیٹھک میں ساتھ ساتھ دو پلنگ بچھے تھے۔ ایک پر رانا بیٹھا نائی سے تنبو بنوا رہا تھا۔ دوسری پر بیٹھے

کی پیالیاں وغیرہ بکھری پڑی تھیں۔ اُن کا ملازم گنجا برآمدے میں کونڈی میں بادام رگڑ رہا تھا۔ اور بدرو کا بھائی قیم ریشمی تہبند سمیٹے اسٹرے سے مُنڈی ہوئی پنڈلی ننگی کیے اُس کے پاس بیٹھا کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ قدرو اور مہرو گاؤ تکیوں پر چڑھ کر بیٹھی لہسن چھیل رہی تھیں "یہ چودھری ہو رہی ہیں گھر؟"

"نہیں منشی جی! منشی جی! میری کوئی چٹھی نہیں آئی۔" مہرو جلدی سے بن کر بولی جیسے دو دن میں اُسے پر لگ گئے ہوں۔

"تیری چٹھی کہاں سے آئے گی گشتیے!" قدرو نے جھٹ سے اُس کا پتا کاٹ دیا۔

سانتھ کے کمرے سے بدرو نکل آئی۔ اُس نے نہایت خوب صورت سوٹ پہن رکھا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں خوشبو کی شیشی تھی جو وہ اپنے لباس پر چھڑک رہی تھی۔ کچھ خوشبو اُس نے رانا پر چھڑکی اور بولی "منشی جی! کوئٹہ کی سوغات لینے جائیے۔ یہ چار سیب زہرہ مشتری کے گھر دینے جائیے اور یہ دو آپ کا حصہ۔"

بدرو نے ایک بھٹو میں سے چھ سُرخ سرخ سیب نکال کر گلاب دین کو تھما دیئے جو اُس نے اپنے چمڑے کے تھیلے میں اڑس لئے اور لمبی لمبی سانسوں سے خوشبو کی لپیٹیں لیتا ہوا باہر نکل گیا۔

زہرہ و مشتری اپنی بیٹھک میں دو اجنبیوں کے ساتھ بیٹھی رمی کھیل رہی تھیں۔ گلاب دین نے جا کر سیب ان کے سامنے رکھ دیئے۔ دونوں بہنوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسری کو دیکھا۔ "منشی جی! دیگ چڑھی ہے اُن کے گھر؟" زہرہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"میں نے نہیں دیکھی۔" گلاب دین نے جواب دیا۔ برآمدے میں اُن کے

سوتیلی بہن کے تو بڑے نے کروٹ بدل کر گلاب دین کی طرف دیکھا اور پھر پیٹھ موڑ لی۔

اگلے دن ڈاک چھانٹتے وقت اُسے زہرہ کے نام کی چٹھی ملی۔ وہ چاہتا تھا۔ بدرو یا قدرو کی چٹھی ملے تاکہ آج پھر ادھر کا پھیرا رہے۔

سہ پہر کو جب وہ ہاتھ میں زہرہ کی چٹھی لیے مکان میں داخل ہوا تو زہرہ اور منتری میٹنی شو دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ رانا برآمدے میں اُن کی بہن سے چہلیں کر رہا تھا جو اُسے اپنے جتنی موٹی موٹی گالیاں دے رہی تھی۔ اُدھر بھینس خریدنے کو رقم دے آیا ہے، اِدھر بھینس کی چپکی لے ہے۔ رانا اُستاد گل آدمی ہے یا بھینسوں کا سوداگر؟ گلاب دین یہ سوچتا ہوا باہر نکل آیا۔

تین روز بعد اُسے اُڑتی اُڑتی ایک خبر ملی۔ پنواڑی کی دکان اُن کے سامنے ہے اُسی سے تصدیق کرنی چاہیئے۔ پنواڑی بولا "جو تم نے سُنا ہے، ٹھیک ہے رانا تو مہرو کے لیے تیار تھا مگر بدرو کی ماں نہیں مانی"

گلاب دین نے پوچھا۔ "عبدالکریم اور قیم راضی تھے؟"

قیم تو سر دائیاں گھوٹ گھوٹ کر پلاتا تھا" پنواڑی مسکرا کر بولا۔ "جس کا مال اُس کا گال نتنی جی!"

خوبصورتی کس طرح بیچی جا سکتی ہے؟ جسم کس طرح فروخت ہو سکتا ہے؟ وہ اس طرح کی باتیں بھی سوچتا جاتا، بازار میں چلتی پھرتی طوائفوں کو خالی ذہن سے دیکھتا بھی جاتا اور چٹھیاں بھی بانٹتا جاتا۔ اُس نے اپنے کام سے کام رکھا اور کتنے ہی دن بدرو قدرو کے گھر نہ گیا۔ ایک دن اُسے موتی بازار میں عبدالکریم ملا جس کی زبانی اُسے معلوم

ہوا کہ انہوں نے اب نئی بھینس خرید لی ہے۔ عبدالکریم نے کہا۔ "کسی روز آنا، ہمارے گھر میں جلسہ ہونے والا ہے۔"

ایک روز بدرو کے نام پانچ سو روپے کا منی آرڈر آگیا۔ گلاب دین نے پڑھا رانا حیات بخش کوئٹہ نے بھیجا تھا۔ آخر میں لکھا تھا، جلسے کے لیے روپیہ بھیج رہا ہوں مجھے بھی اُس دن یاد کر لینا۔ وہ چق اٹھا کر اندر گیا تو بدرو چارپائی پر لیٹی سگریٹ پی رہی تھی۔ آہٹ سُن کر اٹھ بیٹھی۔ "شکر ہے، آپ بھی آئے منشی جی!"

"کوئی خط ہی نہیں تھا.........."

"خط نہ ہو تو کیا آنا چھوڑ دینا تھا۔ ایتے ہوری اتنا یاد کرتے تھے آپ کو۔"

کمروں میں سے عبدالکریم بھی نکل آیا۔ منی آرڈر کا سن کر سب کی باچھیں کھل گئیں۔ مہرو بھی چنگیر اٹھائے بھاگی باہر چلی آئی۔ "اب منشی جی! آپ ذرا کاغذ پنسل لے کر بیٹھ جائیں۔ کاکی! اندر سے حُقّہ اٹھالا۔"

مہرو نے حُقّہ لاکر باپ کے پاس رکھ دیا۔ جس نے منہ میں نے لے کر گلاب دین کو دیگوں کا مسالہ لکھوانا شروع کر دیا۔ گلاب دین کی حیرت دُور کرنے کو عبدالکریم نے کہا۔ "ہم قمرو کی کاکی کی خوشی کرنا چاہتے ہیں۔ قیم تو ناکارہ آدمی ہے۔ کل میں اور آپ جا کر سودا لے آئیں۔ نائی کو بھی ساتھ لے چلیں گے۔"

اس بات چیت میں قدرو اور بدرو بھی کبھی کبھی اپنی تجویزیں پیش کرتی رہیں۔ مہرو پکے فرش پر پالتی مارے لہسن چھیلتی رہی، گلاب دین نے اپنے کان پر اٹکی ہوئی پنسل اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے آج پوچھ ہی لیا۔ "اتنا لہسن کیا کرتے ہیں آپ؟"

قدرو نے کہا۔ "ہمارے گھروں میں سالن اچھا پکتا ہے اور بہت آدمیوں کے لئے
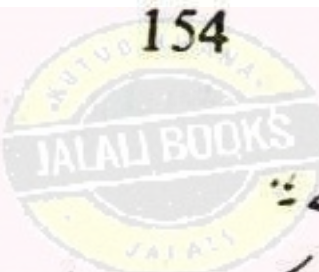
پکتا ہے، اُس میں ڈالا جاتا ہے۔"

بدرو بولی "ہم دن بھر کیا کام کریں۔ اسی طرح اماں کا ہاتھ بٹا دیتی ہیں۔" مہرو اپنی اہمیت دکھانے کے لئے اور تیزی سے لہسن چھیلنے لگی۔

"اللہ خیر رکھے، اب اتوار کو دیکھ لیتا نا۔" عبدالکریم گلاب دین کے کندھے تھپ تھپاتے ہوئے بولا۔

انہوں نے باسمتی چاول، خالص گھی اور مسالے کی پوٹلیاں تانگے سے اُتار کر ڈیوڑھی میں رکھیں تو گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔ عبدالکریم کے کہنے پر گنجا بازار سے چائے کا ایک سیٹ لے آیا۔ وہ چائے کی سرکیاں مار رہے تھے کہ بدرو، قدرو اور مہرو تینوں بہنیں سجی سجائی بیٹھک میں داخل ہوئیں۔ بدرو ہنس کر بولی "اباجی! ہم تو بلاوا دے آئے ہیں۔"

آج بدرو معمول سے زیادہ تیلی اور جاذب نظر آ رہی تھی۔ قدرو کا بدن گدرایا ہوا تھا۔ اُس کی ناک کی کیل بار بار چمک رہی تھی۔ اور مہرو پُربہار شباب کی تمام رنگینیاں لیے اس طرح اُن کے ہم رکاب تھی جیسے دُھلی نکھری بدلیوں کے ہم رکاب بجلی کی کڑک۔

پروگرام یہ تھا کہ اتوار کو دوپہر کا کھانا اور رات کو گانا۔ گلاب دین کی طرف سے جب ڈھل مل کا اظہار ہوا تو عبدالکریم نے کہا۔ "منشی جی! آپ کوئی اوپرے تو نہیں، ہمارے گھروں میں آپ کو کون نہیں جانتا۔ اوّل تو ہم نے زیادہ لوگوں کو بلایا نہیں، یہ اڑوس پڑوس کے چند گھروں کو بلایا ہے۔ باقی رہا گانا تو وہ آپ کی مرضی ہے۔ حافظ صاحب نے کیا فرمایا ہے قدرو پُتّر؟"

قدرو نے کہا۔" بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید۔ کیوں ابا جی؟"

"کچھ نہیں پُتّر! منشی جی کو سگریٹ دو۔"

قدرو نے سگریٹ کی ڈبیا منشی جی کے آگے کر دی۔ گلاب دین نے ایک سگریٹ نکال کر سلگا لی۔" بس آپ ڈاک بانٹ کر سیدھا ادھر ہی آ جائیں۔"

ہفتے کی شام کو نائی نے چولہا گاڑ دیا اور اتوار کی صبح اُس کے دو ساتھیوں نے آ کر کام سنبھال لیا۔ جوتری، لونگ، دارچینی اور زعفران کی خوشبو چاروں طرف پھیل گئی۔ اور دیگوں میں بڑا کفگیر گڑ گڑ بجنے لگا۔ گلاب دین بیدالتی منتظم تھا۔ عبدالکریم نے استاد نورالدین اور منشی گلاب دین کو دیگوں کی نگرانی پر بٹھا دیا۔ بدرو کے سازندوں نے دالانوں میں کرائے کی چاندنیاں بچھا ڈالیں۔ قیم اور اس کے دوستوں نے گاؤ تکیے لگا دیئے۔ پھر آتش دان پر گلاب پاشیاں رکھ دیں اور پوچھنے لگا۔" آپا بدرو ٹھیک ہے؟"

اُس نے کہا۔" ہاں جیتے رہو۔ ٹھیک ہے۔

"آپا سگریٹ کے لیے کچھ پیسے تو دے دو۔" بدرو نے دس روپے کا نوٹ دے دیا۔ وہ اُدھر غائب ہوئی، یہ قدرو کو لے آیا اور بولا۔" بی بی! ہمارا انتظام ٹھیک ہے نا؟"

اُس نے کمروں کا جائزہ لے کر کہا۔" ٹھیک ہے۔"

"بی بی سگریٹ کے لیے کچھ پیسے تو دے دو۔" اس سے بھی دس کا نوٹ ہتھیا لیا۔

دوپہر ہوتے ہی طوائفوں کی ٹولیاں آنی شروع ہو گئیں۔ انگلیوں میں سگریٹ لیے ہوئے، چھالیا چباتی ہوئی، سرگوشیاں کرتی، رنگا رنگ آوازیں، رنگا رنگ لباس، گورے چہرے، ستوائے ہوئے چہرے، بھرے بھرے سینے، پتلی کمریں، دلبری کی تمام ادائیں

اور غمزے، ابریشم و کمخواب کے تھانوں میں لپٹے ہوئے، کچھ جوان، کچھ سرشار، کچھ ادھیڑ دالان جیسے قمریوں اور کبوتریوں کی غٹرغوں سے چہک اٹھا۔

نور پلاؤ، شیرمال اور قورمہ برتایا گیا۔ ایک آتا، ایک جاتا رہا۔ زیادہ قریبیوں کے گھر کھانا پہنچا دیا گیا۔ اس ہجوم دلبراں میں گھرے ہوئے گلاب دین کی نیچے کی سانس نیچے اوپر کی اوپر۔ مہمانوں کا بھگتان ہو چکا تو برتانے والوں کی باری آئی۔ پھر یہ سب کھا پی کر دالان میں بچھی چاندنی پر لیٹ کر سگریٹ کا دھواں اڑانے لگے۔ نائی اپنی دیگیں اور چولے سنبھالنے لگا۔ "پتہ نہیں اپنے چٹھی رساں کو کچھ دیا ہے یا نہیں؟"

استاد نورالدین بولا۔ "بی بی نے چاول دیے تھے۔"

برآمدے سے بدرو بولی۔ "میں نے دیے تھے ابا جی۔"

"ہمارے لیے ہمیشہ اچھی خبریں لاتا ہے۔"

رات کو جب گلاب دین پہنچا مجلس سج چکی تھی۔ فیروزہ نے سلما کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی سڈول کلائیاں سونے کی چوڑیوں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ زہرہ نے ساڑھی کے ساتھ برائے نام سی چولی پہن رکھی تھی۔ جب ساڑھی کا پلو سرک جاتا تو سامنے سے اس کا کسا کسا پیٹ پیچھے سے اس کی چکنی چکنی کمر دکھائی دینے لگتی۔ نگ نے چوڑی دار پاجامے پر گھیر دار قمیص پہن رکھی تھی جیسے اکبر کے زمانے کی مغنیہ۔ جب چلتی تو جوتی کے ستارے اور قمیص کی گوٹ کے بادلے جھل مل جھل مل کرتے۔ ریشمی غرارے میں منتری کے سونے چکنے کے دو پاٹوں کی طرح رگڑ کھا رہے تھے۔ غرارے کو انہوں نے اس طرح بھر دیا تھا جیسے اس میں انڈے بلبلے گئے ہوں۔ منتری کی چھوٹی بہن جو چند مہینے ہوئے آ۔ جا کا سبق لے رہی تھی

اُس نے ماتھے پر جھومر لٹکا رکھا تھا، پلکوں کے تناؤ میں کئی اشارے اور کئی لگاوٹیں پل رہی تھی، شعلۂ جوالہ بنی اِدھر سے اُدھر اپنا آپ دکھاتی پھر رہی تھی۔ بلّو پھُل جھڑی بنی ہوئی تھی۔ اس نے سینے پر دوپٹا نے باندھ رکھے تھے۔ اُس کے کئی روپ تھے مہتابی، انار، پٹ پٹ، گولا لیکن بجلیاں نہیں تھیں۔ تمام بجلیاں آج بدرو کے حصّے میں آگئی تھیں۔ جس کی لم جھڑی آنکھوں پر دراز پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور نسوانیت کے ابریشمیں پرتو سے چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ پان الائچی کی طشتری لیے چاروں طرف تواضع میں جتی ہوئی تھی۔ قدرو جب ہونٹ بھینچ بھینچ کر باتیں کرتی تو اُس کے ہونٹوں کی یاقوتی تراش اور بھی غضب ڈھاتی تھی۔ وہ اپنی انگلیوں کی خفیف سی حرکت سے جب اپنے کٹے ہوئے بال گردن سے ہٹاتی تو یوں لگتا جیسے انگلیوں کی پوروں سے بوندیں شبنم کی پھوار پڑے گی۔

مہرو، مہرو ہی نہیں لگتی تھی۔ اُس کی دنبالے دار آنکھوں میں اتنی گھلاوٹ کہاں سے آگئی تھی۔ پھلجھڑیاں بھرتی پھر رہی تھی اور اُس کے تنگ لباس میں اُس کا انگ انگ نظر آرہا تھا۔ چھوٹی سی نتھنی اُس کے بڑے بڑے ارمانوں اور ان کہے خیالوں کی چغلی کھا رہی تھی۔ اتنے میں ایک جوڑا اندر آیا۔ سرو قد لڑکی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی سمٹے ہوئے ریشم کی طرح محفل میں داخل ہوئی۔ بڑی نزاکت سے ہاتھ کو قوس بنا کر سب کو آداب کیا۔ دالان کی دہلیز پر بیٹھے ہوئے گلاب دین نے پوچھا "فہیم جی! یہ لڑکی کون؟"

وہ اینٹھتے ہوئے بولا "شمّو، میری پھوپھی کی لڑکی خواجہ صاحب کے گھر بیاہی ہے"۔ گلاب دین کے سینے میں جیسے بہت سی سانس رُکی ہوئی تھی۔ اُس نے

ایک لمبی سانس لے ڈالی - وہ خواجہ کی کوٹھی میں چٹھیاں بانٹ چکا تھا - وہ انہیں جانتا تھا۔

سرِراہ کھلے ہوئے سارے پھول سامنے کے رخ اکٹھے ہو گئے تھے۔ رنگا رنگ ہنستے کھیلتے دمکتے چہرے گُل دستہ بنے دکھائی دے رہے تھے۔ خارِ گُل کے ساتھ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خواجہ صاحب اُن صوفوں پر جا بیٹھے، جدھر مرد مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف بیٹھ کر حُقّے کا دھواں اُڑانے والے سازندوں میں سے ایک آدھ نے انہیں سلام کیا اور اپنے ساز لے کر قالین پر آ بیٹھے۔ سب سے پہلے اُبھرے رم خوردہ منشتری کی چھوٹی بہن الماس کو پکڑ کر بٹھا دیا گیا۔ اس کے گانے کے بعد شور مچا "بدرو۔ بدرو۔"

بدرو نے اپنی گھنی پلکیں اٹھائیں - مردوں کی طرف مسکرا کر دیکھا پھر محفل کا ایک نظر سے جائزہ لیا اور اپنی ریشمی شلوار کی کریز چٹکیوں میں تھام کر پائنچے سنبھالتی بیچ میں آ بیٹھی۔ گلاب دین دہلیز پر اور اُونچا ہو گیا - اس نے بدرو کو اس رنگ میں کب دیکھا تھا۔ یا الٰہی بدرو کی آواز کا لہرا تھا یا رم جھم۔ ایک مہمان نے نوٹ نکالا۔ گلاب دین نے ساتھ والے سے پوچھا "کتنے کا ہے؟"

"دس کا۔"

گلاب دین کے سینے سے پھر ایک لمبی سانس نکلی جو دیر سے رکی پڑی تھی۔ وہ سوچنے لگا، بدرو کے اعضا میں یہ لچکیلا پن کہاں سے اترتا آ رہا ہے - اُس کی آواز نکھرتی جا رہی تھی - ایک نوٹ دو نوٹ، تینوں، چار، پانچ ــــ "یہ کون لوگ ہیں؟"

"اپنے اپنے ملاقاتی ہیں - اپنی والیوں کو سلامیاں دے رہے ہیں۔"

اب خواجہ صاحب نے نوٹ دیا۔ پھر شمّو نے، پھر خواجہ صاحب نے، پھر شمّو نے
سب ہنسنے لگے۔ بدرو دو غزلیں گا کر بڑی نزاکت کے ساتھ اُٹھ بیٹھی۔ گگ جی کی
فرمائش ہوئی۔ گگ نے پکّے راگ سے آغاز کیا۔ جب گلا کھنکالا گیا تو ساقی نامہ شروع
کیا۔ آواز کا جادو ملاقاتیوں کے سر چڑھ کر نوٹ پر نوٹ دلوانے لگا۔ گگ نے جوش
میں آکر گھنگھرو باندھ لیے۔ سارے لوگ خوشی سے تالیاں پیٹنے لگے اُس نے بتا دے
دے کر کس کس حسن ادا سے زاہد و محتسب کی چٹکیاں لیں۔ کس کس شان دلربائی سے
کمر لچکا لچکا کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ محفل کی محفل تڑپ اُٹھی۔ بدرو
نے اُٹھ کر سینے سے لگا لیا اور بولی "گگ جی! زندہ باد"
ایک کونے سے آواز آئی "ڈھولک" بلّو نے چونک کر اُس طرف دیکھا جدھر سے
آواز آئی تھی۔ بلّو کے ملاقاتی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر بتایا! "نیز نیاز مند ادھر بیٹھا ہے"
بلّو مسکرا دی۔ مہرو نے ڈھولک لا کر بلّو کے سامنے رکھ دی اور الماس کو لے کر
خود بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ ڈھولک کیا بجی، وضع داریوں کے بند ڈھیلے پڑ گئے۔ بعض
مہمان صوفوں سے اُتر کر قالینوں پر آ بیٹھے اور چٹکیاں بجانے لگے۔ تھاپ دینے
لگے۔ رنگ محفل ہی بدل گیا۔ ایک صاحب پہلے نوٹ دیتے رہے پھر کمر پہ ہاتھ رکھ
کر ناچنے لگے۔ چکر پھیریاں لیتے لیتے قدرو کے پاس جا پہنچے اور ہنستے ہنستے اسے
کھینچ کر اپنے ساتھ لے آئے۔ شور مچا "شاباش ٹھیک ہے، ٹھیک ہے" اُن
صاحب نے قدرو کے گھنگھرو باندھ دیے اور استاد کو اشارہ کیا۔ طبلے پر ہاتھ
پڑا۔ "اٹھئی" قدرو نے اپنے یاقوتی ہونٹوں کی پنکھڑیاں بھینچ کر کلائی پر کلائی سے
گرہ باندھی۔ ایڑی ٹھمکی، آنکھوں میں رس اُترا، پلکوں کا ریشمیں تنا دمستاروں کی طرح

ٹوٹ ٹوٹ کر چاندنی میں گھلنے لگا۔ کائنات گردش میں آگئی اور قدرو رنگوں کا پیکر بن کر گھومنے لگی۔

گلاب دہن کے سینے میں اب کوئی رُکی پڑی سانس باقی نہیں تھی۔ وہ مجسّم حیرت بنا دیکھ رہا تھا۔ اللہ غنی، یہ قدرو تھی۔ اُس کے پاؤں تھے یا خط چھانٹنے کی خودکار مشین۔ بھاپ نکل رہی تھی۔ اُس نے غور سے دیکھا۔ ملازم لوگ محفل میں گرم گرم کشمیری چائے کے پیالے سینیوں میں رکھے پھر رہے تھے۔ چاروں طرف سگریٹوں کا دھواں پھیل رہا تھا۔ وہ ان رنگارنگ آوازوں میں ابھی کچھ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ عبدالکریم اس کے پاس سے گزرتے گزرتے کہہ گیا۔ ”ابھی جانا مت۔“

رات بہت بیت چکی تھی۔ اُس نے دو چار جماہیاں بھی لی تھیں۔ مگر چائے کے گرم گرم پیالے نے اُس کے بدن میں پھر چُستی پیدا کر دی تھی۔ ابھی اُس کا پیالہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ محفل میں سے کسی نے الاپ لیا۔ وہ پھر اپنی جگہ آبیٹھا۔ شمّو کی بلوریں انگلیاں ہوا میں ایک دائرہ بنا رہی تھیں اور اُس کے گلے سے نور کی آواز نکل رہی تھی ایک مہک چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ لفظوں کو انتہا پر لے جا کر وہ اس سبکی اور آہستگی سے انہیں لوٹا دیتی تھی کہ سینوں میں دل ڈول جاتے اور محفل میں واہ واہ ہونے لگتی۔

اُس کے بعد منتری آئی۔ چہرے پر اک سلونا پن اور ان کہے خیالوں کی جھل ملاہٹ، ناک میں فیروزے کی کیل، ہاتھ میں فیروزے کی انگوٹھی۔ اُونچی کُرتی کے نیچے کھل کھل رانیں غرارے میں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔ ایک کونے سے آواز اُٹھی ”پنجابی“

اُس نے ہولے سے استاد سے کچھ کہا اور ماہیا گانے لگی۔ ایک کے بعد دوسرے

دوسرے کے بعد تیسرے پنجابی گیت کی فرمائشیں پوری ہو چکیں تو بدر واڑ رگک نے کہا:۔ "آپا فیروزاں!"

فیروزاں نے سگریٹ کا ایک بھرپور کش لے کر اُسے مسل ڈالا پھر اپنے لبِ لعلیں پر زبان پھیر کر خنجر خونچکاں کو آب دی اور اپنی سڈول کلائیوں میں چوڑیاں سنواتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے پر ایک خاص تمکنت، وقار اور اعتماد تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ کسی وقت میں بڑی بانکی عورت رہی ہوگی۔ "کسی نے کہا: "مرزا صاحباں"

اُس نے اُس طرف ایک غلط انداز نگاہ ڈال کر کہا "اچھا"۔

رات کے سناٹے میں اُس کی کھرج دار آواز بلبلوں کی خبر لانے لگی۔ جب "مرزا" کے بول دہرانے لگی تو جوش میں اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس سے بھی مطمئن نہ ہوئی ڈوپٹہ اُتار کے پھینک دیا اور ہاتھ اُٹھا کر لمبی لمبی تانیں اڑانے لگی جیسے راوی کی لہریں بپھر کر کناروں سے اچھل جائیں اور صاحباں کے بول گاتے وقت وہ اپنی آواز اس طرح سمٹا لیتی جیسے لہروں پر چاندنی رات میں چھوٹے چھوٹے پھول پڑتے لگیں۔ وہ نوٹ سمیٹتی جاتی تھی اور محفل پر اپنی لوچدار آواز کا سحر پھونکتی جاتی تھی۔ ایک نکہت بہار تھی جو ستاروں کی جھل ملاتی روشنیوں کے ہم رکاب گزر گئی۔

گلاب دین اذان ملتے ہی شاہی مسجد کے ایک دالان سے اُٹھا۔ حوض کے ٹھنڈے پانی سے اُس نے وضو کیا۔ آج نماز پڑھنے میں اُسے بڑا لطف آیا۔ خدا کے اُس وسیع و عریض گھر میں اور گلاب دین کی کشادگیٔ دل میں بڑی مماثلت تھی۔ اس نے لمبے لمبے سجدے کیے اور روانہ ہو لیا۔

اُس نے آس پاس کے علاقے کی ڈاک تو دوپہر کو بانٹ دی۔ دو چٹھیاں جو اُس

طرف کی نخیں، انہیں رکھ لیا کہ سہ پہر کو سہی۔ جب سہ پہر کو اُس نے عبدالکریم کے گھر جھانکا تو سب سوئے پڑے تھے۔ اگلے روز جب گلاب دین نے چق اٹھا کر دیکھا تو سب لوگ بیٹھک میں لیٹے ہوئے تھے۔ "آؤ منشی جی کیا حال ہے؟"

"میں کل آیا تھا۔ آپ سب سوتے پڑے تھے۔"

"بُرا حال تھا ہمارا، لڑکیاں تھک گئی تھیں۔ کیوں، اچھی رونق رہی؟" عبدالکریم نے کہا۔

"او جی رونق، کمال ہو گیا تھا۔ گگ جی نے تو حد کر دی۔"

"ابھی تمہارے آنے سے دو منٹ پہلے گئی ہے۔ چار سو ہو گیا اُسے۔ لڑکیوں کو اپنے ساتھ بری امام لے جانے کو کہہ رہی تھی۔ پچھلے سال گئی تھی، بہت کچھ لے کر آئی تھی۔"

"پھر؟"

"پھر۔ یہ بھی تیار ہو گئی ہیں۔"

بدرو تاش پھینٹتے پھینٹتے بولی "جو اللہ کو منظور۔"

پندرہ روز تک تینوں بہنوں کی ہمہ وقت توجہ کپڑے سلوانے پر رہی۔ درزی آتا تھا۔ گنجے کو ڈانٹ پر ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ آخر استاد دل نے بقچے باندھے اور تینوں بہنوں کو لے کر بری امام کے میلے پر چلے گئے دس دن کے لیے۔ عبدالکریم کو اُن کے خط کا بڑا انتظار رہا۔ گلاب دین خط لایا تو عبدالکریم حقّے کی نے مُنہ سے نکال کر بولا۔ "تم سے کون سا پردہ ہے۔ پڑھ کر بھی سُنا دو۔"

بدرو نے خط میں لکھا تھا کہ "ہم پنڈی پہنچ کر خیریت کے ساتھ نور پور پہنچ گئے

ہیں - یہاں دو کمروں کا اچھا ڈیرا مل گیا ہے - رات کو مجرے کی دیں گے تو اندازہ لگ سکے گا کہ میلا کیسا جائے گا - ویسے میلا بہت بھر رہا ہے - چاروں طرف سے طرح طرح کی گانے والیاں آئی ہیں - کچھ ابھی آ رہی ہیں - سُنا ہے یہ میلا اگلے سال نہیں لگے گا - فقط - آپ کی بیٹی - بدر۔"

دوسرا خط آیا، اُس میں لکھا تھا - " خدا کے فضل و کرم سے میلے کے ساتھ ہم بھی بہت اچھی جا رہی ہیں - پانچ دن کی آمدنی چار ہزار ہوئی ہے جو استاد جی آج پنڈی جا کر آپ کو روانہ کر رہے ہیں ہم اٹھارہ انیس کو لاہور پہنچ جائیں گی - ہمارے آنے سے پہلے پہلے صوفوں کا کپڑا بدلوا لیں - صوفوں کے اسپرنگ بھی ڈھیلے ہو چکے ہیں، وہ بھی ٹھیک کرا لیں - بلکہ صوفے ہی نئے خرید لیں - پردے بھی نئے ڈلوا لیں - کنجوسی نہ کریں - وجہ اس کی یہ ہے کہ مہر پر ایک گرگ پٹھان عاشق ہو گیا ہے آپ سمجھ تو گئے ہوں گے اُس سے جو مانگیں گے دے گا - میں نے اور قدر نے کہا، یہ پردیس ہے، آپ لاہور آ کر ہمارے مہمان ہوں، وہاں ہم آپ کی خدمت کریں گے - کہتا ہے ہم کو کیا کھلائے پلائے گا - قدر نے کہا، جو آپ کہیں - بولا - استاد جی ہم کو بس شربت وصال پلا دو، ہم بہت پیاسا ہے - استاد جی نے کہا - خان صاحب آپ آئیں تو ہم آپ کو شربتِ وصال کے کھوہ میں ڈبکیاں دیں گے - غوطے کھلائیں گے - مہر کے سر پر ہمیشہ سو سو روپے کے نوٹ رکھتا ہے - صدقے اور قربان ہو ہو جاتا ہے - مہر بھی اُس سے بڑے نخرے کر رہی ہے - گگ کے نوکر کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے کیونکہ اس نے چاقو مار کر کسی کی انتڑیاں نکال دی ہیں۔"

عبدالکریم نے خط سُن کر اطمینان کی سانس لی اور بولا - " خدا ایسی بیٹیاں سب کو دے گلاب دینا! انہوں نے باپ کو لمبی لمبی رقمیں لا کر دی ہیں، اور اس پیرانہ کو ہمیشہ فخر رہا ہے - اب اللہ کے فضل سے مہر بھی کماؤ ہو جائے گی - پھر ایک اور جلسہ

کریں گے۔"

جب عبدالکریم نے چار ہزار کے بینک ڈرافٹ کا رجسٹری لفافہ گلاب دین کے ہاتھ سے وصول پایا تو اگلے دن ہی قیم جا کر نئے ڈیزائن کے صوفے اور پردوں کا کپڑا لے آیا۔ بیٹھک میں سفیدی ہو گئی۔ شیشے والی دیوار گیریوں پر پالش پھر گیا۔ نئے شیشے لگ گئے۔ ڈبی بازار سے کاریگر بلوا کر نیم چھتی سے لٹکے ہوئے پرانے جھاڑ فانوس کی صفائی کرا دی گئی۔ سارا گھر اُجلا ہو گیا۔

لڑکیاں اُنیس کی صبح آ رہی تھیں اور اُنیس ہی کو پوسٹ آفس کے پچھواڑے والی عمارت کے لمبے کمرے میں چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ سپروائزر نے پوسٹ ماسٹر سے کہا "گلاب دین کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔"

"کیا عرض کرنا چاہتا ہے یہ سالا؟ بلاؤ۔" پوسٹ ماسٹر نے چڑ کر سپروائزر سے کہا۔

دوسرے لمحے گلاب دین پوسٹ ماسٹر کے سامنے کھڑا تھا جو فائل پر نظریں جھکائے کہہ رہا تھا۔ "یہ تمہاری پچھلے سال والی عرضی میرے سامنے پڑی ہے۔ تمہاری منشا کے مطابق تمہاری تبدیلی اب ہیرا منڈی سے واپس مصری شاہ کر دی گئی ہے۔ اب تم کیا عرض لے کر آئے ہو؟"

"حضور! میری صرف اتنی عرض ہے کہ مجھے یہیں رہنے دیا جائے۔"

"کیا کہا؟" پوسٹ ماسٹر نے فائل سے نظر اٹھا کر گلاب دین کو حیرت سے دیکھا۔ اس کی داڑھی غائب تھی۔ لمبی سی تھوڑی نکلی ہوئی تھی اور موٹے موٹے ہونٹوں کے اوپر مونچھوں کا ہلکا ہلکا غبار تھا۔

کرشن چندر

وہ بے حد شریف، باقونی اور معصوم تھا۔ وہ ان معدودے چند خوش قسمت آدمیوں میں سے تھا، جنہیں اپنی بیوی سے والہانہ محبت ہوتی ہے۔ جو پرائی عورت کو تعریفی نگاہوں سے دیکھ لیتے ہیں لیکن کوئی بُرا ارادہ دل میں نہیں رکھتے۔ بعض ماہرین نفسیات کا خیال کہ یہ ناممکن ہے۔ جھک مارتے ہیں سالے۔

اس کی خوش قسمتی کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بیوی شادی کے دوسرے ماہ حاملہ ہو گئی اور جب فرزند ارجمند یعنی ہر وقت رونے بسورنے والا ننھا سا لونڈا معرض وجود میں آیا تو اس کی تبدیلی کسی دوسرے شہر میں ہو گئی۔ یہ شہر اس کے وطن سے پانسو میل کے فاصلے پر تھا۔ ناچار اُسے اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ کر جانا پڑا۔ اس امر کا اسے بہت قلق تھا اور اکثر احباب کی محفل میں چوتھے پیگ کے بعد وہ اپنی حد سے زیادہ حسین بیوی اور خوبصورت بچّے کا ذکر کر کے رو دیا کرتا۔

یہ شہر نیا تھا یعنی اس کے لئے نیا تھا، نوکری بھی نئی تھی، یعنی اس کے لیے نئی تھی، تنخواہ کم تھی۔ یعنی —— ہاں —— بس سب کے لیے کم تھی۔ ہر وقت برخاست کئے جانے کا اندیشہ لاحق رہتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی بیوی کو بلانا خلاف مصلحت

سمجھتا تھا۔ چند مہینوں کے بعد ـــــ البتہ ـــــ وہ ہر چند مہینوں کے بعد اسی طرح سوچتا۔ اس دوران میں اس کی محبت گہری ہوتی گئی۔ اس کی سیفتگی وارفتگی بڑھتی گئی۔

آہ! میں تمہیں کیسے بتاؤں، مجھے اپنی بیوی سے کتنی محبت ہے، میری بیوی تو ایک دیوی ہے۔ اس قدر پاکیزہ، مقدس، معصوم، حسین، جیسے کنول کا پھول ...... اس شہر میں تو اس جیسی ایک عورت بھی موجود نہیں!

وہ ہر روز اپنی بیوی کو خط لکھتا۔ ہر روز اس کی بیوی اسے ایک خط بھیجتی ہر روز ڈاکخانوں میں ان کے ارمان کا چرچا ہوتا۔

یوں بڑا خوش مذاق تھا۔ حسین اور طرحدار عورتوں کی خوبصورتی اور اس کی جزیات کو ایک ماہر جوہری کی طرح پرکھ سکتا تھا۔ اس کی ٹانگیں مدور ہیں، گاؤ دم ہیں، شفاف ہیں، گداز ہیں ...... اس کی سپیدی میں نئے ریشم کا نکھار ہے، ناک خنجر آبدار ہے، .... اس کی جسامت میں پکے ہوئے سیب کی دمک ہے، اس کی اٹھان میں غرور ہے، حیا بھی ہے، جیومیٹری کے اعتبار سے یہ دنیا بھر میں سب سے متناسب کمر ہے ..... لیکن میری بیوی .....!

ایک سال گزر گیا

جنگ شروع ہو گئی۔

چیزیں گراں ہونے لگیں۔ اس کی تنخواہ میں کچھ اضافہ ضرور ہوا تھا۔ لیکن قیمتوں میں اس سے دگنا بلکہ اکثر حالتوں میں چوگنا اضافہ ہوا تھا۔ اس کے اپنے شہر میں چیزیں ابھی اس قدر گراں نہ ہوئیں تھیں اور پھر گھر اپنا تھا۔ کرایہ ادا نہ

کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اس نئے شہر میں تو ..... یہاں وہ اپنے ایک دوست کے ہاں اقامت پذیر تھا۔ مصلحت، جنگ، فراق ...!

اس نے اپنی بیوی کو چار سو بار لکھا۔ "مجھے تم سے محبت ہے۔"

اس کی بیوی نے اسے چار سو اور ایک بار لکھا۔ "پیارے ہم دونوں چاند اور چکور کی طرح ہیں۔"

اس نے اپنی بیوی کا خط پڑھ کر سوچا۔ یہ ٹھیک ہے۔ چاند اور چکور، کبھی چاند ہوتا ہے تو چکور نہیں ہوتا، چکور ہو تو چاند نہیں ہوتا۔ دونوں ہوں تو کچھ اور مصیبت آ جاتی ہے۔ بادل آ جاتے ہیں، بارش ہونے لگتی ہے، جنگ شروع ہو جاتی ہے، تبادلہ ہو جاتا ہے۔

اس نے اپنی بیوی کو لکھا۔ "اپنی نئی تصویر بھیجو۔"

تصویر آئی۔ احباب نے کنول کے پھول کو دیکھا اور گلیکسو بسکٹ یعنی بچے کو بھی، دوست حاسد بن گئے، جلی کٹی سنانے لگے، وہ بہت خوش ہوا۔

ہر روز رات کو سونے سے پیشتر وہ ان دونوں تصویروں کو سرہانے سے نکال کر دیکھتا، کلیجے سے لگاتا، پھر انہیں چومتا، پھر بجلی کی بتی گل کر کے سو جاتا اور تخیل میں دیر تک اپنی بیوی سے باتیں کرتا رہتا، آہ، میری جان، مجھے تم سے ابدی محبت ہے، لازوال، کبھی نہ مرنے والی۔

دو سال گزر گئے، لیکن چھٹی نہ ملی۔

زندگی پھیکی ہوتی گئی۔ یادیں دھندلی ہوتی گئیں ——— سرِ شام وہ اپنے احباب کے ساتھ مال اسٹریٹ میں چکر لگاتا۔

"ارے دیکھنا یار...... وہ نیلی چھریری سی لڑکی، دسنہ، کیا کمان کا سا شناڈ ہے..... ارے وہ غالب کا شعر ہے نا!.....

چند روز سے ایک پارسن بدھو کے پل پر گزرتی ہوئی مان اسٹریٹ میں داخل ہوتی تھی اور جنوبی چوک تک خراماں خراماں چلتی ہوئی پھر پل کی طرف لوٹ آتی تھی...

وہ غزالیں آنکھیں، جیسے آنسوؤں سے دھوئی گئی ہوں ...... وہ شبنمی تبسم... مگر کاوہ زہریلا لوتح......

چند روز وہ اسے دیکھتا رہا اور اس کے مقدس پاکیزہ، معصوم تخیل میں بلبلے پھوٹنے لگے۔

کبھی تو وہ دھانی ساڑھی میں ملبوس ہوتی، کبھی گہرے نیلے سائے میں، کبھی نیم عریاں گاؤن میں ...... ہر بار اس کے سنورے ہوئے بالوں کا ایک خاص انداز ہوتا...... اور وہ شبنمی تبسم۔

وہ گھورتے ہوئے، ٹکٹکی لگائے، اس کے پیچھے پیچھے چلتا۔ جیسے بے پٹرول موٹر رسی سے بندھی ہوئی، کسی تیز رفتار لاری کے پیچھے بھاگتی جاتی ہے۔

چار یا پانچ روز کے بعد وہ پھر کبھی نظر نہ آئی۔

جب احباب نے پوچھا تو کہنے لگا، میری بیوی سے اس کی شکل ملتی تھی۔ تم نے غور نہیں کیا۔؟...... آہ، مجھے اپنی بیوی سے بے اندازہ محبت ہے'......

دراصل بہت کم ایسی عورتیں ہیں جنہیں میرا مذاق سلیم ...... کمبخت معیار حسن اب اتنا بلند ہوگیا ہے کہ اب اوسط درجے کی حسین عورت بڑی مشکل سے جچتی ہے۔

احباب اس وقت مان اسٹریٹ میں سے گزر رہے تھے۔ ایک نے پوچھا۔

"اس لڑکی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

"بازو اچھے ہیں، لیکن چال میں توانائی نہیں۔"

"اور وہ جامنی سائے والی؟"

"گداز ہے، لیکن ذرا بھاری .... ذرا عمر زیادہ ...... ذرا... آہ میری بیوی!"

احباب ہنسنے لگے۔

ایک سال اور گزر گیا۔

اب وہ اکثر اکیلا گھوما کرتا۔ کیونکہ اس کا معیارِ حسن بہت بلند ہو گیا تھا اور بہت سے احباب مطلق تخلیق پسند نہ تھے۔

ان کی زندگی تجرباتی تھی۔ وہ غلطیوں کے قائل تھے۔ ان کا فلسفہ بودا بلکہ ناپید تھا۔ انہیں اپنی بیویوں سے مطلق محبت نہ تھی، کیوں کہ وہ شب و روز ان کے ساتھ جونک کی طرح لپٹی ہوئی تھیں، ان کے لیے ہر عورت جو اُن کی بیوی نہ تھی حسین تھی۔

اَب وہ اکیلا رہ گیا، مان اسٹریٹ میں لوسی کی ٹانگیں اُسے خطرناک حد تک پسند آنے لگیں اور اس کے دماغ کے دھندلکوں میں بار بار ناچنے لگیں۔ اس کا جی چاہا وہ انہیں صرف ایک بار یوں ـــــ چھو کر دیکھ لے .... لارا کی ٹھوڑی کا خم اسے بہت بھلا معلوم ہونے لگا اور کیٹ کا اپنے کٹے ہوئے بالوں کو گھما کر پُرغرور انداز میں سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھنا .... اور جمشید جی لانڈری والے پارسی کی نوجوان بیوی کولہوں کو کیسے چکی کے پاٹوں کی طرح گھما گھما کر چلتی تھی۔ تھی

عجیب نشہ ہے اس میں، کیسی دھلی دھلائی لونڈیا ہے!

اور پھر سینما میں اس نے امریکن سپاہی کے ساتھ جس شوخ کو دیکھا تھا۔ صرف چہرہ ہی اچھا تھا۔ لیکن ایمان سے کیا چہرہ تھا! اور پورے چہرے بھی نصف چہرہ ..... ہے ہے۔ ..... وہ دانت کٹکٹانے لگتا۔ رُخ پر غازے کا ہلکا ہلکا سا غبار ...... جیسے تازہ سیب کی نرم روحیں ......

جی ہاں! اُسے اپنی بیوی سے محبت تھی، اُسے لوسی سے محبت تھی، اُسے لارا سے محبت کتنی سچی، پاک مقدس، بے لوث محبت تھی۔

جب کبھی اسے اپنی پاکیزہ محبت کا خیال آتا، اس کے گلے میں ہچکیاں تڑپنے لگتیں اور آنکھوں میں آنسو، آہ اس کے دل میں کس قدر محبت تھی۔

ایک سال اور گزر گیا۔

کرسمس کی رات تھی۔ مال اسٹریٹ کی چھوکریاں دکانوں کی طرح سجی ہوئی تھیں۔ بجلی کی پاکیزہ روشنی معصوم چہرہ پر تھرک رہی تھی۔ اور ناچ رہی تھیں چکا چکا بوم چک، چکا چکا بوم چک!

کرسمس کی رات تھی اور وہ چار سال سے ایک کنوارے کی طرح معصوم تھا کیونکہ اسے اپنی بیوی سے محبت تھی۔

دوستوں نے کہا "آج کرسمس کی رات ہے۔ کل پھر نیا سال ہے، آؤ تم بھی زندگی کی آگ میں کود جاؤ!"

وہ استہزائیہ انداز میں بولا: "تم کیا جانو محبت کیا ہوتی ہے..... اور پھر ہر شخص کا اپنا معیار ہوتا ہے!"

وہ نکڑ پر اپنے گھر کی طرف مڑ گیا۔

سڑکیں، گلیاں، کوچے، بازار، کسی پرانے نکمے اسٹیشن کی لالٹینوں کی طرح حد نگاہ میں بے ترتیب بکھرے پڑے تھے۔ وہ چلتا گیا۔ اور اس کے دماغ کے دھندلکے میں ناچ گھر کا شور اور خوشبوئیں، اور تھوڑیوں کے خم اور ٹانگیں اور سرسراتی ہوئی ساڑھیاں اور لبوں کے تبسم گھومتے گئے۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا گیا، آخر اُسے معلوم ہوا کہ اس کا گھر آگیا ہے۔ وہ رک گیا پھر ٹھٹھک گیا۔ گھر کی اندھیری دہلیز پر ایک عورت کھڑی تھی۔

اس کی بیوی!

وہ مسکرائی۔

ایک عرصے کے بعد جب اسے ذرا ہوش آیا تو اسے محسوس ہوا کہ یہ اس کا گھر نہیں ہے، اس نے دیکھا کہ وہ ایک چھوٹی اور موٹے ہونٹوں والی عورت کو اپنی آغوش میں لیے شراب پی رہا ہے اور اس سے بار بار کہہ رہا ہے "میری جان، پیاری مجھے تم سے بے اندازہ محبت ہے..... مقدس..... بے لوث.....!

رنڈی نے پھیکے بے جان لہجے میں کہا۔ ہاں! میں چاند..... تم چکور.....

..... ذرا یہ ریڈیو تو کھولو!"

قاضی عبدالستار

سُرخ روشنیوں کے علاقے میں قانون ہتھکڑیاں لیے گشت کر رہا تھا۔ تماش بینوں سے چھلکنے والی گلیوں میں کھلنے والے دروازے خالی تھے۔ سیڑھیاں کیملی روشنی کے تنگ لباس پہنے لرزتے قدموں کے انتظار میں سوکھ کر پتھر ہو چکی تھیں۔ سڑک پر جھکی ہوئی بالکونی کے دریچوں کی آنکھیں چمنیوں کی پلکیں جھپکانا بھول گئی تھیں۔ کمرے کے فانوس لکڑی کے تابوتوں میں دفنائے جا چکے تھے۔ چاندیاں اور مسندیں قالینوں کے ساتھ نہ جانے کہاں بھٹک گئی تھیں۔ سارنگی غلاف کے کفن میں جنازے کی طرح رکھی تھی۔ طبلے کی میل جوڑی پارے کی انگلیوں کے لمس سے ناآشنا ہو چکی تھی اور مستری اونچے تکیے کی مسہری پر خالی پلنگ پوش بچھائے اُداس بیٹھی کسی کتاب کے ورق الٹ رہی تھی۔ روکھے بالوں کی لٹوں پر کہیں کہیں ماضی کے ٹھنڈے الاؤ کی راکھ کے ذرّے جم چکے تھے۔ لانبی شربتی آنکھوں کے گوشوں پر چیل کے پنجوں کے سے دھندلے دھندلے نشان پڑ گئے تھے۔ پان سے سُرخ پتلے پتلے ہونٹ سرمئی محرابوں میں بند تھے۔ کتاب اُس نے کاہلی سے ایک طرف ڈال دی جیسے لڑکے چاٹ کھا کر خالی پتّا پھینک دیتے ہیں۔ گردن گھما کے دیکھا۔ سبز قلعی کی دیوار پر صرف اس گھڑی کا نشان باقی تھا جو دوسری آرائشی چیزوں کے

ساتھ نیلام ہوگئی تھی وہ اپنے خیالوں کے نشے میں جھومتی ہوئی اٹھی۔ ٹلکل سے ہوائی چپلوں میں پاؤں ڈالتی ہوئی پتلے سے صحن میں آگئی۔ دیوار پہ دھوپ کے سونے کا پتر چڑھا ہوا تھا۔ رام کنور کی چھت پہ چھوٹے چھوٹے لڑکے بڑے بوڑھوں کی طرح موٹی موٹی گالیاں بک رہے تھے۔ اس نے سوچا، چار بج گئے ہوں گے۔ یہ سوچتے ہوتے کلیجے پر گھونسا لگا۔ آگے اس وقت کیسا ہنگامہ ہوتا تھا۔ سب لڑکیاں اور بائیاں اپنے اپنے کمروں سے نکل آتیں اور حمام پہ ہلّہ بول دیتیں۔ ایک اندر گنگنا رہی ہے اور گا رہی ہے اور وہ باہر کھڑی بھوک منا رہی ہیں۔ ڈھول دھمّا کر رہی ہیں۔ پھر اندر سے بیگم خالو گلوریاں بناتے بناتے چونک کر ادھر دیکھتیں اور اتنے زور سے چیختیں کہ کھانسی آجاتی۔ بیتی ہوئی شاموں میں ٹوٹی ہوئی پھانسوں کی طرح اس کے سینے میں گڑنے لگیں۔ یادوں کے رینگتے ہوئے بچھوؤں سے پاؤں بچاکر وہ پھر اپنے کمرے کی طرف چلی کہ دہلان زینے پہ قدموں کی چاپ ہوئی ۔۔۔۔ قدموں کی چاپ۔

ایک زمانہ تھا کہ قدموں کی چاپ پہیلیاں بجھاتی تھی۔ وہ محض قدموں کی آواز، مضبوطی اعتماد، گھبراہٹ اور عجلت سے ہی آنے والوں کو جان لیا کرتی تھی۔ پاؤں کی جوتی بھی تو شخصیت کی ترجمان ہوتی ہے۔ لیکن یہ چاپ بڑی پھسپھسی اور کمزور تھی جیسے سیلی ہوئی گزک۔ اس نے تخیل کی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ استاد مٹن بھورا کرپچ کا جوتا پہنے ہانپتے چلے آرہے ہیں اور بیچ بیچ استاد مٹن ہی سامنے کھڑے تھے۔ بھاگل پوری چادرے کی مرگھلی شیروانی کے دونوں دامن ایک دوسرے سے دور دور پڑے تھے۔ بغیر کالر کے قمیض کے کھلے گلو سے گردن کا گڑھا نظر آرہا تھا۔ کئی دن کی باسی داڑھی نے نوکیلے مارے آم جیسے دبلے پتلے چہرے کو بیجان بنادیا تھا۔ سڑی ٹانگوں کے مانند میلا پاجامہ اس کے سامنے کھڑا تھا وہ اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں آتے، اطمینان سے مونڈھے پر بیٹھ گئے جس کے حاشیے

پر ساری کے کنارے کی گوٹ لگی تھی۔ المونیم کا اگال دان اٹھا کر منہ کے پاس لائے ہاتھ کی ہتھیلی کا پردہ بنا کر پان کی لگدی اگال دان میں ڈالی۔ میلی دو پلی ٹوپی سے جھانکتے ہوئے کھچڑی سے برابر کیئے اور مشتری کو دیکھا جو ان کے سامنے مسہری کی پٹی پر اس طرح ٹکی ہوئی تھی جیسے بوڑھے آدمی راستے میں چھتری کھول کر سستانے لگتے ہیں۔ استاد نے جب ڈرامائیت پیدا کر لی تو بولے۔ "میں نے ہر طرح چھان پھٹک لیا ہے۔ تول پرکھ لیا ہے۔ وہ سونا ہے اور تمہارے اوپر اپنی جان تک نچھاور کر سکتا ہے۔"

آخری جملے پر مشتری گلابی ہو گئی۔ آنکھیں جھک گئیں جیسے خاندانی بہوئیں ایسی باتوں پر شرما جاتی ہیں۔

"وہ بہت جلدی کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ نکاح فوراً ہو جائے۔ جلدی تو ہم کو بھی ہے مگر ہم نے ظاہر نہ ہونے دی۔ پرسوں پہلی تاریخ ہے اور جمعہ بھی .... مکان بھی خالی کرنا ہے...... بس چار بول پڑھا کر قصہ پاک کر دو۔ یہ روز روز تلنگے سپاہیوں کی گالی گفتاری سنتے سنتے کان پک گئے ہیں۔" اتنا کہہ کر انہوں نے پہلو بدلا۔ مشتری نے جیسے چونک کر ٹوکا۔ "پان تو کھاتے جایئے۔" وہ پھر مونڈھے میں پھیل گئے اور مشتری تانبے کی پٹاری کی طرف لپکی۔

⁂

استاد جی کب کے جا چکے تھے۔ جھٹپٹے کی دھوپ چھاؤں کی پوشاک پر رات نے سیاہی کی پچکاری خالی کر دی تھی۔ اس نے دریچے کے پاس کھڑی ہو کر دیکھا۔ میلی میلی روشنیاں سیاہ رات کے جسم پر برص کے داغوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ دور کہیں موٹر کا ہارن گونجتا تو وہ لرز جاتی، گویا وہ پولیس ہی کی موٹر ہے اور پولیس اسی کے گھر میں گھسنے کے لیے آ رہی ہے۔ جب سنسناہٹ تک خاموشی کے سمندر میں ڈوب جاتی، تب دل قابو میں آتا پھر منیر کے گھر سے طبلے کی مانوس گمک گھنگروؤں کی میٹھی کھنک کی باہوں میں باہیں ڈالے آتی

اور اس کا منہ چڑانے لگی۔ اس نے کمرے کے مغربی دروازے کو ذرا سا کھول کر دیکھا۔ منیر کے دروازے پر وہ لمبا چوڑا بورڈ چمک رہا تھا۔ جس کے سائے وہ قانون کے ظالم ہاتھوں سے محفوظ اپنا دھندا چلا رہی تھی۔ اُس نے دھڑاک سے دروازہ بند کر دیا۔ یا پورا دروازہ اٹھا کر منیر کے منہ پہ پٹخ دیا۔ باورچی خانے سے غریبن بُوا کے چپاتی پکانے کی آواز آ رہی تھی، جیسے کم سن لڑکیاں بغیر گھنگرو پہنے ننگے فرش پر توڑے لے رہی ہوں۔ اس نے سنسان کمرے کو اداس نظروں سے دیکھا تو چودہ برس کی بھرپور زندگی کی یادیں اشرفیوں کے توڑوں کی طرح کالی دیواروں سے برسنے لگیں۔

پہلی بار جب وہ اس گھر میں آئی ہے تو کیسے کیسے فل مچائے تھے اور کیا کیا قیامتیں ڈھائی تھیں لیکن دھیرے دھیرے بیگم خالہ کی دھمکیوں، خاطروں اور خوشامدوں نے اُس کا ایک ایک بل نکال دیا اور وہ ایک سدھی ہوئی گائے کی طرح کھڑی رہنے لگی۔ جس کا جی چاہتا اسے دوہ لیتا پھر وہ عیش سامنے سے گزر گئے جو اُس نے خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ وہ زیور اور کپڑے اس کے جسم پر سرسرانے لگے اور جگمگانے لگے جن کی ایک جھلک بھوک پیاس اڑا دیتی ہے، وہ بے پناہ محبت یاد آئی جسے پانے کے لیے لوگ اپنی جانیں کھو دیتے ہیں اور یہ سب کچھ اسی اجڑی چھت کے نیچے اور ننگی دیواروں کے حلقے میں ہوا ..... پھر جیسے ایک دُبلا پتلا گندمیں رنگ کا لڑکا کمرے میں آ کر شرمانے لگا۔ بال الجھے ہوئے، سفید شیروانی گلے تک بند، گھنے ابروؤں کے نیچے پلکیں جھپکاتی ذہین حیا اور آنکھیں، نیچی تلموں کے پاس گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی، موٹے موٹے ہونٹوں سے چمکدار دانتوں کی جھانکتی ہوئی قطار، وہ کھڑا رہا۔ آنکھ ملی تو اپنا نیلا ہاتھ اٹھا کر سلام کر لیا اور اس کے کہنے پہ سینڈل کا تسمہ کھولنے لگا..... پھر جیسے اس تصویر پہ اگالدان گر پڑا ..... وہ اپنے کلیجہ میں رکھے ہوئے البم سے دوسری تصویر نکال رہی تھی کہ کسی نے اس کے کان میں

کہا: "اس کی عمر جانتی ہو مستری بائی؟"

"ہاں۔"

"کیا ہے......؟"

"بیس..... اکیس برس۔"

"اور تمہاری.....؟"

"میری..... میری وہی جو صورت سے نظر آتی ہے۔"

"اپنے آپ سے جھوٹ مت بولو مستری۔"

"چونتیس پینتیس سال ہے میری عمر۔"

"تو یہ مصری کا بنا ہوا نازک نازک میٹھا میٹھا لڑکا تمہارے فالتو چودہ پندرہ برس لادے جائے گا اپنے کندھوں پر؟" اور جیسے کسی نے اچھے بھلے خواب سے جگا دیا۔ غریبن بُوا برآمدے میں کھڑی بڑبڑا رہی تھیں۔ اُس نے سوئچ کی طرف لپک کر روشنی کر دی اور غریبن بوا کے ہاتھ سے کھانے کی سینی لے کر سہری پر رکھ لی۔

٭

پھر جمعہ آگیا۔ پیلے داڑھیوں کے مقدس حلقے میں ہنکاری بھر آئی۔ پھر کچہری لے گیا۔ ایک کورے کرکراتے کاغذ پر کانپتے ہاتھوں سے دستخط کرائے۔ "ریکس" میں انگریزی فلم دکھائی۔ "کوالٹی" میں مغلی کھانے کھلائے اور طلوع ہوتے ہوتے سینچر کی گود میں ڈال دیا..... دلان کے تیز بلب کی روشنی میں سارا صحن جھلک رہا تھا۔ سفید بستر اور ریشمی تکیے تازے پھول کی خوشبو سے بوجھل تھے۔ وہ مچھر دانی لگے بستر کے کنارے بیٹھ گئی پہلی بار نگاہ اٹھائی۔ دُبلا پتلا نازک لڑکا دلان میں کھڑا اپنی سفید شیروانی اتار رہا تھا۔ پھر سینڈل کے تسمے کھولے اور باتھ روم سلیپر میں اپنے گلابی پاؤں ڈالتا گھسیٹتا اُس کے

پاس آگیا اور اپنے ہاتھوں سے پھولوں کے گہنے پہنانے لگا۔ ہار، کرن، پھول، دست بند اور بازو بند، سب اپنے ہاتھوں سے پہناتا رہا۔ اعجاز کی کم سن شریر انگلیوں کے لمس نے جیسے اُسے شراب پلا دی۔ آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ سر سے پاؤں تک ایک شیریں سپردگی میں شرابور ہو گئی ۔

ململ کے کرتے صندوقوں میں کھو گئے۔ کہانیوں کے کرداروں کی طرح چھ مہینے سونے اور چھ مہینے جاگنے والے پنکھے ایک بار پھر غلافوں کی دلائیاں لے کر سو گئے مستری نے سگھڑ بیویوں کی طرح رضائیاں کھولیں ۔ روئی دھنکوائی اپنے پرانے پاجاموں کی گھوٹ لگا کر اپنے ہاتھ سے تاگے ڈالے۔ کمرے کی مسہریاں دھوپ کے رُخ بچھوائیں اور اعجاز کے سوتی کپڑے دھلا کر بکس میں رکھ دیے۔ اعجاز ناشتہ کر چکا تھا۔ سمر کے بھورے سوٹ پر سرخ ٹائی لگائے۔ دھوپ کا چشمہ صاف کرتا باہر نکلا تو اس کا جی چاہا کہ پیار کرے۔ وہ سویٹر اور سلائیاں دوسرے مونڈھے پر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ چوڑے سنہری بورڈر کا سرخ پلو کھینچا۔ سرخ بلاؤز میں پھڑپھڑاتے ہوئے چاندی کے کبوتروں کو چھپا کر ٹھمک ٹھمک چلتی ہوئی جیسے ہوا اعجاز کے قریب پہنچی، اعجاز نے اُسے دبوچ لیا۔ شریر بازو اس کی کمر سے گزر کر گول کولھوں میں پھنس گئے۔ آنکھوں سے گردن کے نیچے دور تک تمام جسم بوسوں کی شبنم سے بھیگ گیا۔ وہ اپنا آپ فراموش کیے نشے میں ڈوبی کھڑی رہی۔ ہوش آیا تو اعجاز جا چکا تھا۔ دروازے کی زنجیر کھنک رہی تھی۔ وہ اسی طرح نہ جانے کب تک کھڑی رہتی کہ خانساماں سودا لے کر واپس آ گیا .... پھر اس نے خانساماں کے ساتھ مل کر وہ بھاری سیاہ صندوق اٹھایا جو ان کی مسہریوں کے پائنتی رکھا تھا اور میز کا کام انجام دیتا تھا صحن

میں لاکر کھولا۔ نیفتھلین کی گولیوں کی تیز مہک سے اُس کے نتھنے بھر گئے۔ اچھے سگار کی خوشبو اور کپڑوں سے آتی ہوئی ان گولیوں کی ہلکی ہلکی مہک اسے ہمیشہ سے پسند تھی۔

وہ اعجاز کے تمام کپڑے نکال نکال کر دھوپ میں ڈالتی رہی، پھر ٹائیاں، مفلر دستانے اور موزے پھیلانے لگی۔ بکس میں بچھا ہوا اخبار بہت میلا اور بھربھرا معلوم ہوا۔ اس نے چٹکی سے پکڑ کر اٹھایا اور پھینک دیا۔ ابھی اخبار زمین تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ایک تصویر نکل کر زمین پر گر پڑی۔ اس نے اٹھایا تو رنگے ہوئے ناخنوں سے سجی ہوئی انگلیاں کانپنے لگیں...... وہی بیچ سے نکلی ہوئی مانگ...... وہی سیاہ چمکیلی چھوٹی چھوٹی آنکھیں...... وہی جھکی ہوئی اونچی ناک...... وہی رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں...... وہی ہو بہو وہی...... بالکل وہی۔

"صاحب نے کس سوٹ پر استری کرانے کو کہا تھا؟" خانساماں نے سامنے آکر سوال کیا۔

"اوں...... ہاں...... یہ لے جاؤ...... نیلا۔"

وہ نیلے سوٹ کو ہینگر میں لگا کر چلا گیا۔ تصویر اس کے گھٹنوں پر رکھی رہی۔ خانساماں نے کھانا لگا کر اٹھا لیا۔ سوٹ لاکر الماری میں ٹانگ دیا اور باورچی خانے میں بیٹھ کر روئی کی مرزئی میں بٹن ٹانکنے لگا۔ دھوپ ٹھنڈی ہو گئی۔ ہوا کی دھار اور تیز ہو گئی۔ جب وہ اٹھی تو اس نے صرف یہ دیکھا کہ خانساماں چائے کے لیے انگیٹھی بنا رہا ہے۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی کمرے میں آئی اور بستر پر نڈھال ہو کر گر پڑی۔ پھر دروازے نے چیخ کر اعجاز کی آمد کا اعلان کیا لیکن اس نے نہ سنا۔ اعجاز آکر اس کے سرہانے کھڑا ہو گیا لیکن اس نے نہ دیکھا۔ جب اعجاز نے اپنے ٹھنڈے ملائم

ہاتھوں سے اس کی آنکھیں بھینچ لیں تو وہ پھر اس دنیا میں واپس آ گئی۔ آہستہ سے اپنے سفید نرم گرم ہاتھ اعجاز کے ہاتھوں پر رکھ دیے اور اُٹھ بیٹھی۔ اعجاز اسی طرح کپڑے پہنے اس کے پاس بیٹھا تھا۔ جب اعجاز کے ہونٹوں نے اجازت دی تو اس نے پوچھا "یہ تصویر کس کی ہے"؟ اور اپنے پہلو سے تصویر اٹھا کر اعجاز کے ہاتھوں میں پکڑا دی۔

اس نے ایک نظر تصویر کو دیکھا اور اپنی آنکھیں اٹھا کر منتری کے رخساروں پر رکھ دیں۔ "ابو کی ہے...... میرے ابو کی"۔

"کہاں ہیں یہ"؟ جیسے اعجاز کے گریبان نے سوال کیا۔

"انتقال ہو گیا"۔ اس کے چمکیلے بالوں میں منہ چھپائے ہوئے اعجاز نے جلدی سے جواب دیا۔

"کیا نام تھا"؟

"اُفوہ...... تم کو کیا ہو گیا ہے...... یہ کون سا وقت ہے ان بے تکے سوالوں کا؟...... ان کا نام ممتاز احمد تھا۔ آج سے ۱۴ برس پہلے ہمارے ہاں ڈاکہ پڑا تھا۔ اس میں شہید ہو گئے تھے، میں چھ برس کا تھا اس وقت، اس لیے تفصیل نہیں سنا سکتا۔ سن لیا تم نے؟

--- ✽ ---

پھر کوئی آواز نہ آئی۔ اس نے اعجاز کی گردن سے ہونٹ ہٹا لیے اور اپنی پیشانی دبلے پتلے سینے کی ہڈیوں پر ڈال دی اور چودہ برس پہلے کی زندگی کا نگار خانہ کھل گیا۔

...... ہائے...... وہ کیسی رات تھی...... آدھی رات تک ممتو میاں (ممتاز میاں) اس کی زلفوں سے کھیلتے رہے۔ ہونٹوں اور آنکھوں سے الجھتے رہے۔ جب نیند کا نشہ گاڑھا ہو گیا۔ "اب اٹھ پڑو منتری کپڑے پہن لو"۔

! وہ آنکھیں گڑولنے لگیں اور پہرے والوں کی آوازیں کراہنے لگیں اور کتے سو گئے

" یہ جھمکے بہت بھدے ہیں تمہارے ..... وہ کرن پھول پہن لو۔"

تب متو میاں ایک بھرپور چٹکی لے کر اُس کے پہلو سے اُٹھے۔ اُس کے

" ڈیرے " سے نکلے جس کا دروازہ متو میاں کے آبائی مکان میں کھلتا تھا اور جس میں

دن رات آدھ سیر کا قفل پڑا رہتا تھا اور جو صرف اتنی دیر تک چھٹی پاتا تھا جتنی دیر

تک متو میاں اس کے ڈیرے میں رہتے تھے۔ " یہ آج کیسی ساڑھی باندھی ہے

تم نے ..... بالکل ڈھیلا ہے ..... لاؤ میں ٹھیک کر دوں"

اماں نے لالٹین دکھلائی۔ اس نے زنجیر چڑھا دی اور اماں کی پٹی سے پٹی ملا کر

سو رہی۔ "ساڑھی سمیٹ لو نا ..... رکشے کے پہیے کے نیچے آ جائے گی۔"

جب اس کی آنکھ کھلی تو آفتاب سوا نیزے پر آچکا تھا۔ ڈاکو گھس آئے تھے۔

گولی چل رہی تھی۔ اور ہواؤں سے لڑ جانے والے متو میاں بندوق لے کر نکل پڑے

تھے اور ایک گولی کی ٹھوکر کھا کر جنت سدھار گئے تھے۔

" متھاس میں تمہارے لیے ٹکڑے منگا لیے ہیں۔ تم کو کوالٹی کے ٹکڑے

پسند ہیں نا ؟

اُس نے کیسی کیسی منتیں کیں ..... خوشامدیں کیں لیکن آخر کار سب رائیگاں گئیں۔ کسی

نے اس بیسوا، رنڈی اور کلنکنی کو متو میاں کی میت کے پاس نہ پھٹکنے دیا۔ اُس نے متو میاں

کی بستر لگی مسہری کو ہی اُن کا جنازہ مان لیا۔

" یہ رائتہ تو ڈال لو بریانی میں ..... خالی کھا رہی ہو۔"

اُس نے مسہری کے پائنتی بیٹھ کر اپنی چوڑیاں اتاریں اور پائے کے پاس رکھ دیں

وہیں کی مٹی اٹھا کر اپنی اجڑی ہوئی مانگ میں بھر لی، نہا کر نکلی تو اماں کا ٹین بکس کھولا اور اماں کا موٹا جھوٹا دوپٹا اوڑھ لیا۔ مارکین کا پاجامہ چڑھا لیا۔ پہلے تو اماں ان چوچلوں کو جھیلتی رہیں۔ پھر ایک دن بھڑک اٹھیں۔ جب سوکھ گئیں اور مار تھک گئی تو ایک صبح اماں نے کرائے کا ادھا منگوایا اور اس کے ساتھ سوار ہوئیں۔ خیر آباد کے اسٹیشن پر کھڑی ہوئی ریل گاڑی کے زنانے ڈبے میں گھس گئیں۔ چار باغ اسٹیشن پر یکے والے سے جھگڑتی رہیں۔ پھر پردہ بند ھوا کہ اسے بٹھا لیا اور بیگم خالہ کے گھر اتر پڑیں۔ رات گئے تک بیگم خالہ سے کھسر پھسر کرتی رہیں اور صبح اس سے ملے بغیر اسے گلے لگائے بغیر اپنی دوسری بیٹی زہرہ کے گھر چلی گئیں جو بنارس میں بڑی دھوم کا دھندا کئے ہوئے تھی۔

"کیوں، زیور کیوں اتار رہی ہو منتری۔ آج پہنے پہنے لیٹ رہو..... کتنی اچھی لگتی ہو اس ساڑھی میں۔"

اس کے دماغ میں آتش بازیاں چھٹتی رہیں اور جسم اس سے بہت دور کسی غریب دیہاتی لڑکے کی طرح کسی شادی کا جشن دیکھتا رہا۔

"دیکھو..... یہ سیاہ سوٹ پہنے ہے۔ نہانے کا ہے۔ یہ دنیا کی سب سے خوب صورت ایکٹریس ہے۔" اب اس نے آنکھ کھولی۔ وہ اعجاز کے پہلو سے لگی میٹنیر کی بالکونی میں بیٹھی انگریزی فلم دیکھ رہی تھی اور سامنے ایک عورت، انگریز جوان اور خوبصورت عورت اپنے جسم کے مختلف زاویے دکھا رہی تھی اور اعجاز کا بازو اس کی کمر میں پڑا تھا اور اعجاز کی شریر انگلیاں اس کے کولہے پر رینگ رہی تھیں اور اعجاز کے ہونٹ اس کے کرن پھول کے پاس لرز رہے تھے۔

پھر دیوار پر لگی ہوئی گھڑی نے چار بجائے۔ مچھر دانی کے پردے اٹھے ہوئے تھے۔ سبز گلوب کے اندر بلب روشن تھا۔ کرسی کی پشت پہ ستاروں بھری ساڑھی پڑی تھی جیسے کہکشاں چپ مرا گئی ہو۔ زینت کا بلاؤز دوسری کرسی کے تکیے پہ ٹنگا ہوا تھا اور پہلو میں اعجاز سو رہا تھا۔ بال الجھ کر پیشانی پہ آ گئے تھے۔ نیلے سلیپنگ سوٹ اور دھیمی خواب ناک روشنی میں وہ بڑا حسین لگ رہا تھا۔ اُس نے گردن جھکائی اور اعجاز کی پیشانی چوم لی پھر اپنے سیاہ پیٹی کوٹ سے سفید گھٹنے چھپا لیے۔ اعجاز کا بازو اپنی کمر سے نکال کر بستر پہ رکھ دیا اور مسہری سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔ ٹھنڈی زمین بُری لگی۔ وہ چپل دیکھ رہی تھی کہ کسی نے اُس کے کان میں جیسے کہا۔ "مشتری بائی ...... کہاں جاؤ گی؟ باہر کالی پھنکارتی سڑک پر لوہے کے بھیڑیے دوڑ رہے ہیں۔ بڑے بڑے بوٹ پہنے بل ڈاگ تمہارے بالائی جسم کے انتظار میں زبان نکالے رال ٹپکا رہے ہیں۔ بھاری بھاری ہتھکڑیاں، لمبے لمبے فاقے کڑوے کسیلے دُکھ سب تمہارے منتظر ہیں۔"

"یہ ٹھیک ہے لیکن اگر میاں (متو میاں) زندہ ہوتے تو ...... یہ لڑکا میرا سوتیلا بیٹا ہوتا ...... اُس نے اعجاز کو مامتا سے دیکھا اور اپنے ہاتھ کی سلی ہوئی ہلکی سی دلائی اسے اڑھا دی۔

"یہ تم کہہ رہی ہو مشتری بائی ..... جس کے سائے سے بھی متو میاں کی میت اور اولاد کو محفوظ رکھا گیا، تم اگر چیخ چیخ کر اعجاز کو یقین دلاؤ کہ تم متو میاں کی داشتہ رہی ہو تو بھی وہ تمہاری جدائی برداشت نہ کر سکے گا۔"

"مشتری بائی ..... تم متو میاں کی داشتہ رہی ہو ..... بیوی نہیں۔"

"مشتری بائی در در کی ٹھوکریں کھانے سے بہتر ہے کہ اس گھر میں راج کرو۔ اعجاز کی تنخواہ چار سو روپے ہے۔ جائداد ہے۔ نہ ماں، نہ باپ، نہ بھائی، نہ بہن..... تم اس کی اور اس کی ہر چیز کی مالک ہو۔" وہ آگے بڑھی تو کسی نے ہاتھ پکڑ لیا۔

"اور اعجاز کا کیا ہو گا..... وہ کیا کہے گا تم کو..... بے وفا..... غدار..... طوائف....."

"طوائف تو میں ہوں..... لیکن طوائفوں کے سینے میں دل ہی نہیں ہوتا، دماغ میں کچھ اصول بھی ہوتے ہیں۔"

"مشتری! تمہارے جانے کے بعد کوئی اعجاز کسی مشتری پر اعتماد نہ کرے گا۔ ..... بیوی نہ بنائے گا۔"

"ہر اعجاز ہر مشتری پر آج بھی بھروسہ نہیں کرتا۔"

اُس نے اپنا سوٹ کیس کھولا۔ ایک معمولی سی ساڑھی سیاہ پٹی کورٹ پر لپیٹ لی۔ سوٹ کیس کے کور کی جیب میں بنک کی کتاب اور لاکر کی کنجی ٹٹولی تو آواز آئی۔ "کتنے روپے ہیں مشتری؟"

"دو ہزار"

"اور زیور؟"

"بیس تولے"

"چلو دو چار برس تو عزت و آبرو سے زندہ رہ لوگی پھر؟"

"پھر..... پھر کیا؟"

"پھر یہ کہ شاہ مینا صاحب کی درگاہ یا چار باغ اسٹیشن پہ ایک بھکارن کی
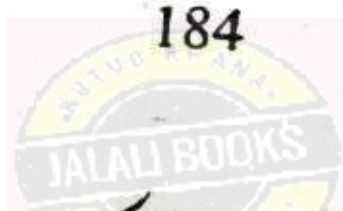
تعداد میں اضافہ ہو جائے گا۔"

"اچھا اگر جانا ہی ٹھیرا..... تو وہ زیور تو رکھ لو جو اعجاز نے تمہیں پہنائے ہیں جو اس کے خریدے ہوئے نہیں ہیں ... منّو میاں کی وراثت سے ملے ہیں ....اور منّو میاں شوہر تھے تمہارے۔"

"یہ سچ ہے ..... لیکن اس نے اعجاز کی خریدی ہوئی ساڑیاں بکس نکال کر ڈال دیں اور اپنی بہت سی چھوٹی بڑی چیزیں چھوڑ دیں اور بکس بند کر کے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی سرخ آنکھیں ساڑھی کے آنچل سے خشک کیں، کنگھے سے بال برابر کیے اور سوتے ہوئے اعجاز کو اس طرح دیکھا جس طرح ماں اپنے بیٹے کو دیکھتی ہے اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ صدر دروازہ کھولا تو کسی آواز نے اُس کی سماعت کا دامن پکڑنے کے لیے ہاتھ پھیلا دیے لیکن وہ ٹھنڈی سرمئی دھند کے سمندر میں پھاند پڑی۔
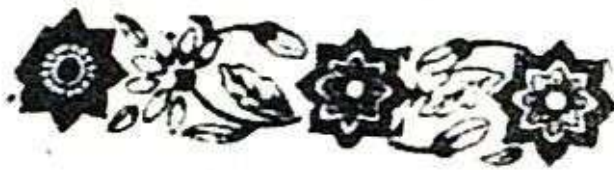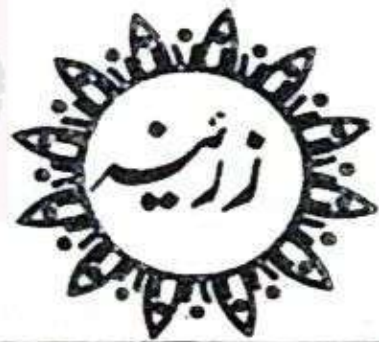
سپیرا لون

سینے کے بل لیٹ کر، کہنیاں بڑھائے، رانیں کشادہ کئے رخسار پر ہاتھ رکھے وہ ایک لمبے سنہری پن سے کتانِ سبز کے تکئے پر چھوٹے چھوٹے سوراخوں کی حاشیہ کاری کر رہی تھی۔ دوپہر کے دو گھنٹے بعد جب وہ جاگی ہے تو کثرتِ خواب کی وجہ سے جسم میں ایک گرانی سی محسوس کرتی تھی اور اس لمحے سے لے کر اس وقت تک وہ تنہا اپنے بے ترتیب بستر پر لیٹی رہی تھی، اس طرح کہ اس کے جسم کا ایک حصّہ لہراتے ہوئے لمبے بالوں سے ڈھنپا تھا۔

اس کے بال گھنے، تابان سمور کی طرح نرم، پر پرواز سے طویل تر، ملائم اور بے حصر اور ان میں گرمیٔ حیات لرز رہی تھی۔

اُس کی پشت کا نصف سے زیادہ حِصّہ، ان بالوں سے ڈھنپا تھا۔ یہی بال پھیلتے ہوئے اس کے عریاں بدن کے نیچے ہوتے ہوئے زانوؤں کے پاس جمع ہو گئے تھے گھنے، گھنگریالے، چمک دار، اس پشمینۂ گراں ارز کو دیکھ کر ان بالوں کی وجہ سے جنمیں گندم کی سرخی اور چمک دار دھات کی تابانی موجود تھی اور جو اس وقت اس عمرِ نازنین کو اپنی آغوش میں لئے تھے۔ سکندریہ کی کسبیاں اُسے زرینہ کہہ کر بلاتی تھیں۔

یہ بال نہ تو شام کے محبوبانِ سلطانی کے ملائم بالوں کی طرح تھے نہ ایشیائی نازنینوں کے خضاب آلودہ بالوں کی طرح، ان میں مہہ پیکرانِ مصر کے بھورے اور سیاہ بالوں کی شان بھی نہ تھی، یہ بال آریائی اقوام سے خاص ہیں... جلیلویوں کے بالوں

کی طرح جو ریگ زاروں کے اس پرے رہتے ہیں۔

زرینہ، اسے خود اس نام سے محبت تھی۔ جو نوجوان اس کی بارگاہِ جمال میں حاضر ہوتے تھے اور ہر صبح پھولوں کے ہار اور اشعار اس کے آستانے پر رکھ جاتے تھے۔ وہ اپنے الفاظ میں اسے زہرہ حسن و جمال کی دیوی زائیدہِ کفِ دریا سے تشبیہ دیتے تھے۔ اُسے زہرہ پر اعتقاد نہیں تھا لیکن اُسے یہ بات پسند تھی کہ لوگ اُسے زہرہ سے تشبیہ دیں اور کبھی کبھار وہ خود بھی ہیکل زہرہ میں جاتی تھی اور ایک مخلص سہیلی کی طرح اس کے آستاں پر عطر دان اور نقاب بھینٹ چڑھاتی تھی۔

وہ جھیل ناصرت ایک ایسی سرزمین میں پیدا ہوئی تھی۔ جہاں دھوپ کا لطف بھی تھا اور سایوں کی دلکشی بھی، جہاں چپے چپے پر گلبن اور گیراس تھے۔

اکثر رات کے وقت، اس کی ماں مسافروں اور شاہراہ یروشلم کے سوداگروں کا انتظار کیا کرتی اور سنسان کھیتوں کی لمبی گھاس میں اپنے آپ کو اُن کے حوالے کر دیتی۔ اس کے ہم وطن اس پر جان چھڑکتے تھے۔ راہب اس کے گھر سے احتراز نہ کرتے تھے کہ وہ مخیر اور رسوم مذہبی کی پابند تھی۔ اس نے قربانی کے بکروں کی قیمت ادا کرنے سے کبھی انکار نہ کیا تھا۔ فرشتگانِ قضا وقدر ربِ جلیل کی نعمتیں اس کے گھرانے پر نچھاور کرتے تھے۔

جب اُسے حمل ٹھہر گیا تو چاروں طرف سے بڑی لے دے ہوئی۔ کیونکہ اس کا شوہر نہ تھا۔ ایک کاہن نے جو اپنی پیشنگوئیوں کے لئے مشہور تھا کھلے الفاظ میں کہا۔

" اس عورت کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہو گی اور ایک دن ایسا آئے گا کہ

ایک بہت بڑی قوم کا ایمان اور اس کی دولت اس لڑکی کے گلے کی زینت ہو گی۔"

غریب ماں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کیونکر ہوگا؟ لیکن اس نے لڑکی کا نام "سارہ" رکھا۔ عبرانیوں کی زبان میں اس کے معنی "شہزادی" ہیں۔

زرینہ کو ان تمام واقعات کا کوئی علم نہ تھا کیونکہ کاہن نے اس کی ماں کو تنبیہ کر دی تھی کہ جو لوگ کسی پیشین گوئی کا موضوع ہوتے ہیں ان کو پیشین گوئی کی تفصیلات سے مطلع کرنا خطرناک ہوتا ہے۔ اُسے اپنے مستقبل کے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے خیالات اکثر اسی محور کے گرد پھرتے تھے۔ اُسے بچپن کے حالات بھی کم یاد تھے اور اُسے ناپسند تھا کہ کوئی اس زمانے کی باتیں کرے۔

اس کے حافظے میں جس واقعہ کی یاد خوب روشن تھی وہ یہ تھا کہ جب اُس کی ماں آوارہ گردی کے لئے نکلا کرتی تو روز "بہ خیال احتیاط" اسے ایک حجرے میں بند کر جاتی۔ قید کی ان نہ گزرنے والی گھڑیوں میں اس کے خوف کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ اسے وہ گول کھڑکی بھی خوب یاد تھی جہاں سے اُسے جھیل کی سطح آب، کھیتوں کا دُھواں سا نیلا نیلا رنگ اور اپنے وطن کا شفاف آسمان نظر آتا تھا جو نرم اور سُبک رو ہواؤں کو محیط تھا۔ گھر کے دائیں بائیں طرفا اور کتان سُرخ شگفتہ تھے۔

ان نتھرے ہوئے پانی کی نہروں میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں نہایا کرتی تھیں جس کے کنارے شگفتہ گیاس کی جھاڑیوں میں پھول ہی پھول تھے اور کمرکوہ پر بڑے بڑے سوسن کے پھول شگفتہ تھے۔

جب وہ بارہ سال کی ہوئی تو نوجوان شہسواروں کے ایک گروہ کے ساتھ

بھاگ گئی جو اسے گاؤں کے کوئیں کے پاس ملے تھے۔ وہ ہاتھی دانت فروخت کرنے کے لیے ٹائیر کی طرف جا رہے تھے اور ذرا کوئیں کے پاس ٹھہر گئے تھے کہ اپنے گھوڑوں کی دموں میں گوناگوں پھولوں کے طرّے لگالیں۔ اُسے خوب یاد تھا کہ جب وہ اُسے پُشتِ اسپ پر بٹھا کر لے اُڑے تو شدتِ جذبات سے اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ اور اسے خوب یاد تھا کہ اسی شب وہ پھر ٹھہرے تھے۔ وہ رات ایسی تابناک اور صاف تھی کہ ستارے نظر ہی نہ آتے تھے۔ اسے یہ بات بھی بھولی نہ تھی کہ جب وہ ٹائیر میں داخل ہوئے تو وہ سب سے آگے ایک کرتل گھوڑے کے کجاوے میں بیٹھی تھی اور گھوڑے کی ایال کو بھینچ کر پکڑ رکھا تھا۔ وہ غرور کی ایک ادائے خاص سے اپنی پنڈلیاں ہلاتی چلی جا رہی تھی تاکہ شہر کی عورتیں وہ خون بھی دیکھ سکیں جو اس کی نوکِ پا تک بہہ آیا تھا۔ اسی رات وہ مصر کی طرف روانہ ہو گئے اور وہ انہیں ہاتھی دانت کے سوداگروں کے ساتھ بازارِ مصر جا پہنچی تھی۔ دو ماہ بعد وہ سوداگر اُسے ایک مکان میں چھوڑ کر چلے گئے۔ اس مکان میں مہتابی تھی، ایک سنگ ستون؟ ایک ردّئیس آئینہ، غالیچہ، نئے تکیے اور ہندو کنیز، جسے کسبیوں کے بال بنانے میں کمال حاصل تھا۔

جس رات سوداگر گئے، اسی رات اور تماش بین آئے اور دوسری رات

اور، اور، اور

اس کا مکان شہر کے مشرقی حصّے کے کنارے واقع تھا اور وہ بھی ایسے محلے میں جسے براشیمؔ کے یونانی نوجوان بہ نظرِ حقارت دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دیر تک اس کے گاہک اس قسم کے لوگ رہے جن سے اس کی ماں آشنا

تھی یعنی سوداگر اور مسافر! کسی دوسرے طبقے کے آدمی سے اُسے واسطہ ہی نہ پڑتا۔

وہ ان تماش بینوں، ان مختصر لمحاتِ محبت کے خریداروں سے بیگانہ سی رہی۔ وہ ان کی محبت سے لذت اندوز ہونے کا گُر جانتی تھی۔ اور ان کے دامِ عشق میں گرفتار ہونے سے پہلے اُن کو دھتا دیتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس کے بعض تماشبین مستقلاً اس کے دامِ گیسو میں اسیر ہو کر رہ گئے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ قافلہ سالاروں نے اپنی چیزوں کو اَونے پَونے بیچ ڈالا تاکہ اس کی لذتِ التفات خرید سکیں اور چند راتوں کے بعد پھر قلاش ہو جائیں اس دولت سے اُس نے جواہرات بستر، عشرت کے تکیے، نادر خوشبوئیں منقش عبائیں، چار کنیزیں خریدیں۔

اُسے بہت سی زبانیں آتی تھیں۔ ہر ملک کے افسانے اُسے اَزبَر تھے اسیریا والوں نے اُسے ڈانزی اور اشتر کے افسانے سنائے تھے۔ فونیشیا والوں نے استوریت اور اڈونس کے۔

جزیرے کی یونانی لڑکیوں نے الفیس کی حکایت سناتے ہوئے اُسے پیار کرنے کے وہ عجیب طریقے سکھائے تھے۔ جن کو سیکھ کر پہلے پہل تو زرینہ حیران ہوئی تھی لیکن بعد میں اُن کے بغیر ایک لمحہ کے بیلے رہ بھی نہ سکتی تھی۔

وہ اطلانتا کی داستان ہائے محبت سے بھی واقف تھی اور خوب سمجھتی تھی کہ اس کی طرح نرم و نازک اندام بنسی بجانے والیاں قوی نوجوان کی

جوانی کا رس نچوڑ کر اُسے ایک مشتِ استخواں بنا سکتی ہیں -

سات سال کے عرصے میں اس کی ہندو کنیز نے بڑے صبر و تحمل سے اُسے پالی بوتھرا کی کسبیوں کے فنِ محبت کی تمام پیچ دار اور لذت انگیز تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا - محبت بھی نغمہ گری کی طرح ایک لطیف فن ہے - کیفِ نغمہ کی طرح - لذتِ محبت سے بھی نفیس و لطیف، شدید و قوی اعصاب کو جھنجھنا دینے اور رگوں کو مرتعش کر دینے والی کیفیات پیدا ہوتی ہیں -

زرینہ، جو اس فن کے تمام ترنمات اور تمام نزاکتوں سے باخبر تھی، اپنے آپ کو جائز طور پر ہیکل زہرہ کے مغنی بلبلنگو سے زیادہ باکمال سمجھتی تھی -

سات سال اسی طرح گزر گئے اور اسے کبھی خیال نہ آیا کہ زندگی اس سے زیادہ مسرور یا متنوع ہو سکتی ہے - لیکن بیسویں سال میں قدم رکھنے سے پہلے جب وہ لڑکی سے عورت بنی اور اس نے اپنی چھاتیوں کے نیچے اس جمیل شکن کو دیکھا جو آغاز بلوغت کا نشان ہے تو ناگاہ اس کے دماغ میں بلند نظری پیدا ہو گئی -

اور اب، دوپہر کے دو گھنٹے بعد جب وہ سو کر اٹھی اور کثرت خواب کی وجہ سے اس نے اپنے جسم میں ایک گرانی سی محسوس کی تو سینے کے بل لیٹ کر کہنیاں بڑھائے، رانیں کشادہ کئے، رخسار پر ہاتھ رکھے، وہ ایک لمبے سنہری پن سے کتانِ سبز کے ایک تکئے پر چھوٹے چھوٹے سوراخوں کی حاشیہ کاری کرنے لگی -

وہ فکر میں غرق تھی -

پہلے اس نے چار چھوٹے چھوٹے نقطوں سے مربع بنایا اور مرکز میں

ایک نقطہ لگایا، پھر اس سے بڑا مربع بنایا۔ پھر ایک دائرہ بنانے کی کوشش کی لیکن یہ کام مشکل نظر آیا، چنانچہ اس نے بے پروایانہ تکیے میں جہاں جی چاہا پن چھبونی شروع کی اور پھر بلند آواز سے کہا

" جلوہ، جلوہ "

جلوہ اس ہندو کنیز کا نام تھا۔ اصل نام تو اس کا جلتندچندرا پالا تھا یعنی "جلوۂ مہتاب کی طرح پانی پر رقصاں" لیکن زریبہ مختصراً اسے جلوہ کہہ کر پکارا کرتی تھی۔

کنیز آگے بڑھی لیکن آستان کے پاس کھڑی رہی۔

" جلوہ کل یہاں کون آیا تھا؟"

" آپ کو خبر نہیں کیا؟"

" نہیں، میں نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں، کیا کچھ شکل وصورت کا اچھا تھا میں تو سمجھتی ہوں کہ میں سارا وقت سوئی ہی رہی، تھک گئی تھی میں، مجھے کچھ یاد بھی تو نہیں، کس وقت واپس گیا تھا بھلا وہ؟ کیا صبح ہی صبح"

" پو پھٹنے کے وقت کہتا تھا"

" کیا کچھ دے گیا ہے؟ اچھی رقم؟ - خیر! مجھے نہ بتاؤ، کوئی بات نہیں۔ ہاں کیا کہتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد کیا کوئی اور نہیں آیا۔؟ کیا وہ پھر واپس آنے کو کہتا تھا؟ میرے کنگن لاؤ۔!"

کنیز ایک صندوقچہ لے کر حاضر ہوئی لیکن زریبہ نے مشکل سے نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا ہوگا۔ اس نے اپنی بانہیں سر سے بلند کیں اور کہا۔

" جلوہ، جلوہ! میں چاہتی ہوں کہ کچھ ہو۔ عجیب عجیب سی باتیں، نئے نئے

واقعات، کیا کیا کچھ؟

جلوہ نے کہا "ہر بات نئی ہے۔ ہر بات عجیب ہے۔ ہر بات یا پھر کوئی بات بھی نہیں۔ تمام دن ایک ہی جیسے ہیں؟"

زرینہ نے کہا "نہیں ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ تمام دن ایک ہی جیسے نہ ہوتے تھے۔ تمام دُنیا میں، ہر ملک میں دیوتا زمین پر اُترتے تھے اور فانی عورتوں سے محبت کرتے تھے۔ آہ! کون سے بستروں پر اُن کے آنے کا انتظار کیا جائے! وہ ہمیں کس جگہ ملیں گے جو آدمیوں سے کچھ بلند تھے کیا دعائیں مانگوں تاکہ اُن کا دیدار نصیب ہو، جو مجھے کچھ سکھا سکتے ہیں، یا کم از کم مجھے بھولنے اور بھول جانے کا گُر بتا سکتے ہیں، اگر دیوتا نیچے نہیں اُترتے، اگر وہ مر چکے ہیں یا بوڑھے پھونس ہو چکے ہیں تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے وہ محبت نصیب نہ ہوگی جو زندگی کے ساز سے محبت بھرے یا درد بھرے گیت نکال سکے"

اس نے کنیز کی طرف سے منہ پھیر لیا اور اپنی انگلیاں مروڑنے لگی پھر کہا۔

"مجھے تو یوں دکھائی دیتا ہے کہ اگر کوئی مجھے دیوی کی طرح پوجتا تو مجھے اس کے ستانے میں بڑا لطف آتا جا ہے وہ گھُل گھُل کر مر ہی کیوں نہ جاتا لیکن یہ جو میرے پاس آتے ہیں یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ اُن کو رُلا جائے اور سچ پوچھو تو قصور بھی میرا ہی ہے۔ میں انہیں خود بلاتی ہوں تو وہ مجھ سے محبت کیا کریں گے؟"
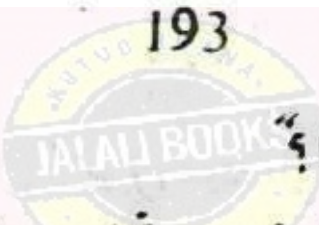
آج کون سا کنگن پہنئے گا؟"

"تمام - جاؤ - مجھے کسی کی ضرورت نہیں - جاؤ دروازے پر کھڑی ہو جاؤ اور اگر کوئی آئے تو اُسے کہہ دو کہ میں ایک سیاہ فام حبشی کی بغل گرم کر رہی ہوں جو مجھ سے روپیہ اینٹھتا ہے ۔"

"جاؤ ۔"

"باہر نہیں جائیں گی آپ؟"

"ہاں - لیکن تنہا - کپڑے بھی تنہا پہنوں گی اور جا کے واپس نہ آؤں گی جاؤ، جاؤ ۔"

زرینہ نے ایک پاؤں غالیچے پر رکھا اور تن کر کھڑی ہو گئی - جلوہ چپ چاپ باہر جا چکی تھی -

زرینہ اپنے حجلے میں آہستہ آہستہ، ادھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر پھرتی رہی، ہاتھ گردن کے پیچھے، کمرے کی ٹھنڈی سلوں پر، جو پسینے کو خشک کر دیتی ہیں، ننگے پاؤں رکھنے میں جو لذت ہے اس میں محو تھی - پھر وہ حمام میں داخل ہوئی -

پردہ آب میں سے اپنے جسم کو دیکھنا، اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا - اس وقت اسے اپنا جسم پتھر پر پڑی ہوئی کھلی سیپی کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ اس کی جلد بے عیب اور رنگ میں آہنگ ہو جاتی تھی - اس کی رانوں کے خطوط لمبے ہوتے، ایک نورِ نیلابی میں تحلیل ہو جاتے تھے - اس کا تمام جسم سیال ہو جاتا تھا - اور اس کے ہاتھ پہچانے نہ جاتے - اس کا جسم اتنا سبک ہو

جانا تھا کہ وہ دو انگلیوں کے بل اپنے آپ کو سنبھال کر قائم رکھ سکتی تھی تیر سکتی تھی اور پھر سنگِ مرمر کے فرش پر بیٹھتے وقت پانی میں نرم و نازک بلبلے پیدا ہوتے تھے جو اس کی ٹھوڑی سے چھو جاتے تھے۔

پانی ایک حرکتِ بے صدا کے ساتھ اس کے کانوں میں داخل ہوتا تھا اور اس میں ایک بوسے کی نازک تحریک لذت شامل تھی۔ اس کے بدن کا ہر حصہ عشق انگیز تعریف کا سزاوار اور پیار کا عذرِ مجسم بن جاتا تھا۔ یہی وہ ساعت تھی جب زرینہ اپنی پرستش کرتی تھی۔

دِن ڈھل رہا تھا وہ کھڑی ہوئی پانی کے ٹب سے باہر نکلی اور دروازے کی طرف چلی۔ اس کے پاؤں کے نشان سنگِ مرمر پہ چمکنے لگے، لڑکھڑا کر، گویا تھک گئی ہے اس نے دروازہ کھولا اور چپ چاپ کھڑی ہوگئی۔ ہاتھ بڑھا ہوا چٹخنی پر تھا، پھر اندر گئی اور اپنے بستر کے پاس جا کر بھیگی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ کنیز سے کہا۔

"میرا بدن پونچھو۔"

مالا بار کی کنیز نے اسفنج کا ایک ٹکڑا لیا اور بھیگے، بھاری، سنہری بالوں میں پھیرا، بال خشک کئے، لٹیں اٹھا کر نرمی سے جھٹکیں پھر اس نے اسفنج روغن کے برتن میں ڈال کر تر کیا اور پاؤں سے لے کر گردن تک ہر حصۂ جسم پر پھیرا، پھر ایک سُرخ کپڑے کا ٹکڑا لے کر زور زور سے مَلا دلا، جس سے ملائم جلد آگ بھبھوکا ہوگئی۔

زرینہ کانپتی ہوئی سنگِ مرمر کی ایک ٹھنڈی نشست گاہ پر بیٹھ گئی اور

ہوئے سے کہا "بال بناؤ"

گم ہوتی روشنی کی متوازی شعاعوں میں بال جو ابھی تک بھاری اور گیلے تھے، دھوپ میں بارش کی طرح چمکنے لگے۔ کنیز نے مٹھیاں بھر بھر کر لچھے اُٹھائے اور گوندھ کر ایک پیچدار شکل دے دی۔ جس میں جگہ جگہ تیر کی طرح سیدھی پنیں لگی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا سانپ نے بل کھائے ہیں اور جسم پر تیر ہی تیر کھبے ہیں۔ اس گندھی چوٹی میں تین بل سبز موباف کے دیئے گئے اور اس کی آب و تاب میں ریشمی گیسو بند کی درخشانی اضافہ کر رہی تھی۔

زرینہ ایک ہاتھ بڑھائے ذرا دور رکھ کر چمکتے ہوئے تانبے کا آئینہ دیکھ رہی تھی جس میں اُسے کنیز کے سیاہ ہاتھ گھنے بالوں میں چستی سے حرکت کرتے نظر آرہے تھے۔ ان ہاتھوں نے گھنگریالے بالوں کو اپنی جگہ پر بٹھایا آوارہ بالوں کو چُن چُن کر دوسرے بالوں میں شامل کیا اور اب بالوں کی شکل مٹی کے اس ظروف کی سی ہو گئی جو شاخ آہو سے ملتا ہو۔

جب یہ سب کچھ ہو چکا تو کنیز اپنی مالکہ کے سامنے دو زانو ہو گئی اور "جبل زہرہ" کی تزئین کی تا کہ اس کے عاشق زرینہ کے بدن میں فنِ مجسمہ سازی کا کمال عریانی دیکھ سکیں۔

زرینہ نے متانت سے کہا "غازہ لگاؤ"

جزیرہ ڈیاس کورس سے آئی ہوئی ایک چھوٹی سی صندوقچی میں جو شجرِ گل سے بنائی گئی تھی، ہر قسم کا غازہ اور سامان آرائش موجود تھا۔

کنیز نے موئے شتر کے برش کو سیاہ غازہ میں ڈبویا اور مژگان خمدار

کو اس سے سیاہ تر کیا گیا۔ تاکہ آنکھوں کی نیلگونی دوچند ہو کر نظر آئے، گلِ سیاہ سے آنکھوں کو سرمئی بنایا گیا جس سے آنکھیں زیادہ غلافی ہو گئیں، شنگرف کے دو نقطوں سے گوشہ ہائے چشم کے سرخ و نازک ترین حصّوں کو سرخ تر بنایا گیا، غازے کی پائیداری کے لیے چہرے اور چھاتیوں پر روغن ملا گیا۔ ایک نرم و نازک پَر کو سفیدہ میں ڈبویا گیا اور گردن و بازو پر سفید خطوط کھینچے گئے پھر ایک بُرش کو شنجار میں ڈبو کر لب لعلیں اور دہان شکریں کو سرخ رنگا گیا۔ اور اسی چیز سے نوک پستاں پر بھی ہلکی سی رنگ آمیزی کی گئی۔ پھر اُس نے اپنی انگلیوں سے گالوں پر پسی ہوئی سرخی ملی جیسے سبک لطیف شنجرفی بادل ہوں۔ اور کمر کے نیچے کولہوں کے پاس تین گہرے شنجرفی خط کھینچے گئے جن کی وجہ سے کولہوں کے گوشت میں چاہ ذقن کی طرح دو گڑھے پیدا ہو گئے جو بدن کی حرکت کے ساتھ متحرک ہو جاتے تھے پھر فلس پوست سے کہنیاں رنگی گئیں اور دسوں ناخن سرخ کئے گئے۔

آرائش ختم ہو چکی تھی۔

آخر زرینہ مسکرائی اور کہا "گا کر سناؤ"

وہ سنگ مرمر کی کرسی پر تن کر بیٹھی تھی، اس کی نینوں سے طلائی شعاعیں نکل رہی تھیں، اس نے گلے پر ہاتھ رکھ لئے، اس طرح کہ انگلیاں پھیلی ہوئی تھیں، اس کے غازہ آلود، سرخ ناخن شانوں کے درمیان سلک یاقوت معلوم ہو رہے تھے۔ اس نے سفید پاؤں فرش سنگی پر ایک دوسرے سے قریب رکھے تھے۔

جلوہ دیوار سے لگ کر ہندوستان کے نغمہ ہائے عشق گانے لگی۔

اس نے یک آہنگ آواز میں کہا۔ "زرینہ تیرے بال ان شہد کی مکھیوں کی طرح ہیں جو کسی درخت کی شاخوں میں ہجوم کر رہی ہوں، جنوب کی گرم ہوائیں، تیرے بالوں کو جنگ عاشقاں کی شبنم سے تر کر رہی ہیں اور ان میں سے شب زاد پھولوں کی خوشبو آتی ہے۔"

اور زرینہ نے مدہم سروں اور زیادہ سریلی آواز میں کہا۔

"میرے بال اس نامحدود دریا کی طرح ہیں جو غروب آفتاب کے آتشیں منظر کے وقت کسی میدان میں بہہ رہا ہو۔"

جلوہ: "تیری آنکھیں سوسن آبی کی طرح ہیں جو سطح آب پر نیلگوں، بے حِس اور بے حرکت نظر آتی ہیں۔"

زرینہ: "میری آنکھیں میری پلکوں کے سائے میں گہری جھیلوں کی طرح ہیں جن پر سیاہ شاخیں جھکی پڑتی ہوں۔"

جلوہ: "تیرے لب دو نازک پھول ہیں جو آہوئے سرخک کے خون سے رنگین ہیں۔"

زرینہ: "میرے لب زخم کے سوزاں کناروں کی طرح ہیں۔"

جلوہ: "تیری زبان وہ خنجر خونفشاں ہے جس سے تیرا زخم دہان عیاں ہے۔"

زرینہ: "میری زبان جواہرات سے مزیّن ہے اور میرے لب ہائے نعلیں کے سائے سے رتنار۔"

جلوہ: "تیرے بازو ہاتھی دانت کی طرح سڈول اور بھرے بھرے ہیں
اور تیری بغلیں سنہ کی طرح ہیں"

زرینہ: "میرے بازو ساق سوسن کی طرح طویل و گاؤدم ہیں اور میری انگلیاں
برگہائے گل کی طرح آویزاں"

جلوہ: "تیری پنڈلیاں پیل سفید کی طرح خرطوم ہیں اور تیرے پاؤں دو
گل سرخ"

زرینہ: "میرے پاؤں سطح آب کے کنول کی طرح ہیں اور میری پنڈلیاں
غنچۂ سوسن کی طرح"

جلوہ: "تیرے پستان سپر سیمیں کی طرح ہیں جن کے فلس خون سے لبریز
ہیں"

زرینہ: "میرے پستان مہتاب کی طرح ہیں اور پانی میں عکس مہتاب کی
طرح"

جلوہ: "تیری ناف گلگوں سرنگ زار کا چاہ عمیق ہے اور تیرا شکم اس بچۂ
بز کی طرح ہیں جو اپنی ماں کی چھاتیوں سے چمٹا ہو"

زرینہ: "میری ناف ایک جام واژگوں ہیں جس پر ایک مروارید مدور
رکھا ہو اور میرا جسم خفی اس ماہ نو کی طرح ہے جو درختوں کے جھنڈ میں سے
نظر آرہا ہو"

خاموشی طاری ہو گئی۔ کنیز نے ہاتھ اٹھا کر سر جھکا لیا۔

زرینہ نے کہا۔ "وہ ایک گل ارغوان ہے جو شہد و خوشبو سے لبریز ہے

ہے۔ وہ ایک مارِ دریائی ہے۔ زندہ اور نرم، وہ دیارِ موت کی طرف جانے والے انسانوں کے لئے جائے پناہ ہے۔"

کنیز نے نہایت آہستہ سے کہا۔ "وہ ایک شے ہے مہیب و ہولناک، وہ میڈوسا ڈائن کا چہرہ ہے۔"

زرینہ نے کنیز کی گردن پر اپنا پاؤں رکھ دیا اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "جلوہ"

رفتہ رفتہ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ رات اپنے آشیانہ فلکی سے اُتر آئی تھی۔ لیکن چاند ایسا تابناک تھا کہ حجلے میں ایک نیلگوں نور کا سیلاب جاری تھا، زرینہ نے اپنے عریاں بدن کی طرف دیکھا۔ جسم کے نقطہ ہائے نور جامد تھے اور سائے تاریک و سیاہ۔

ناگاہ وہ کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی۔

"جلوہ ہم کیا سوچ رہے ہیں۔ رات ہو گئی اور میں ابھی تک باہر نہیں گئی۔ اب تو ساحل دریا کے چبوترے پر سوئے ہوئے ملاحوں کے سوا اور کوئی نہ ہو گا۔ جلوہ بتا تو سہی، کیا میں خوبصورت ہوں؟ جلوہ بتا تو سہی، کیا آج روز سے زیادہ خوب صورت ہوں؟ کیا تجھے خبر ہے کہ سکندریہ کی تمام عورتوں میں، سب سے زیادہ حسین ہوں؟ کیا یہ سچ نہیں کہ جو شخص میرے گوشۂ چشم کے اشارے کے دائرے میں ایک بار گردش کر چکتا ہے وہ پھر کتے کی طرح میرے پیچھے پیچھے چلتا ہے؟ کیا یہ سچ نہیں؟ میں چاہوں تو اسے غلام رکھ سکتی ہوں؟ جو چاہوں اس سے سلوک کر سکتی ہوں، کیا یہ سچ نہیں کہ جن سے ملوں، ان کو میں موہ سکتی ہوں کہ میرے حکم ماننے کے سوا کچھ اور کر ہی نہ سکیں، کپڑے پہناؤ جلوہ۔"

زرینہ کے بازوؤں کے اردگرد سانپ کی طرح پیچ و تاب کھائے بازو بند تھے ۔ جلوہ نے چلبلیاں پہنائیں اور گندم رنگ پنڈلیوں پر چرمی تسمے باندھ دیئے خود زرینہ نے اپنے شکم نرم و گداز کے اردگرد ایک کمر بند دوشیزگی لپیٹ لیا جو کمر سے بُنِ ران تک لٹکتا تھا ، کانوں میں بڑے بڑے چھلے پہنے ۔ انگلیوں کو انگوٹھیوں اور نگینوں سے سجایا اور گلے میں وہ طلائی زنجیریں پہنیں جو بیقیس کی دیو داسیوں نے بنائی تھیں ۔

کچھ عرصہ وہ عُریاں صرف زیورات میں ملبوس کھڑی اپنے ننگے جسم کو دیکھتی رہی پھر ایک دراز سے تہ کی ہوئی کتانِ زرد کی ، صاف و نازک و تابناک شال نکالی اور پاؤں تک اپنے آپ کو اس میں لپیٹ لیا ۔ اس باریک کتان میں سے اس کے جسم کا جو ذرا سا حصّہ نظر آ رہا تھا اس پر آڑے ترچھے جھول نظر آتے تھے ، اس کی کہنی تنگ قبا میں صاف ابھری نظر آتی تھی ۔ دوسرے ہاتھ میں وہ شال کا دامن اٹھائے تھی کہ خاک آلود زمین سے مس نہ ہونے پائے ۔

ایک نازک سی پروں کی پنکھیا لے کر وہ باہر نکلی ۔

آستان کی سیڑھیوں پر کھڑی ، دیوار سفید پر سر ٹیکے جلوہ اپنی مالکہ کو محوِ خرام دیکھ رہی تھی ۔ وہ آہستہ آہستہ خالی بازار کے نورِ مہتاب میں نہائے ہوئے مکانوں کے پاس سے گزر رہی تھی اور ایک بے قرار سایہ اس کے عقب میں تڑپ رہا تھا ۔

وہ مختلف ہاتھوں سے بکتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھی ۔ اور اب تو اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ پہلی بار کب بکی تھی ؟ شاید وہ ان پرانی باتوں کو یاد کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ گوبر اور گندگی کے ڈھیر سے بھلا گندگی کے سوا نکل ہی کیا سکتا ہے پھر گندگی کے اس ڈھیر کی گہرائی میں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے ۔کیونکہ اس کی بو سے تو ویسے ہی دماغ پھٹتا ہے ۔

پچھلی باتوں میں اسے صرف یہاں تک یاد پڑتا تھا کہ چھٹی مرتبہ وہ ایک پینجے (دھنیے) کے ہاتھ میں تھی۔ پینجا ذات کا کشمیری تھا اور ساٹھ پینسٹھ کے پیٹے میں ہونے ہوئے بھی وہ ہٹا کٹا دکھائی دیتا تھا - غربت کی وجہ سے اسے ابھی تک کوئی عورت نہیں ملی تھی ۔ اسی دوران یہ بکاؤ شے اس کے گاؤں میں آئی تو اس نے اپنے تنگ و تاریک مکان کے ایک گوشے میں دبائی ہوئی پرانی ہنڈیا میں سے چاندی کے پورے پانچ سو روپے نکال کر اسے خرید لیا تھا ـــــــــ یہاں اس کی کوکھ سے ایک بیٹے نے جنم لیا ـــــــــ جس کا ڈیل ڈول اس کے باپ جیسا تھا پر چہرہ ماں کی طرح گول مول اور خوبصورت تھا ۔

پینجا سردیوں میں گھر سے دور گاؤں گاؤں لوگوں کے سرہانے، گدے اور لحاف بھرنے کا کام کرتا رہتا۔ وہ دو دو، چار چار روز گھر سے باہر رہتا تھا۔ گرمیوں میں قصابوں کے ساتھ بکرے خریدنے کے لئے منڈیوں میں پھرتا اور کئی کئی دن گھر کا منہ نہ دیکھتا۔

پیشہ کئی عورتوں کا کاروبار ہو گا مگر اس کی ضرورت بن چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خصم کی عدم موجودگی میں جو جی چاہتا، کرتی۔ مشکی ہوئی کتیا کی طرح اس کی بو چاروں طرف پھیل جاتی اور پینجے کے گھر سے باہر جاتے ہی اسی گاؤں کا یا قریبی علاقے کا کوئی کتا دیسی شراب کی بوتل بغل میں دبائے اس کے پاس پہنچ جاتا۔ بوتل کا کارک اڑا کر اسے یوں لگتا جیسے وہ اب بھی کوٹھے پر بیٹھی ہے اور کسی نرچی اور خانگی ہے پینجے کا کوٹھا سائیں کے تکیے کے قریب گاؤں سے ذرا ہٹ کر واقع تھا اس لئے عام لوگ اس بات سے آگاہ نہیں تھے۔ پینجا بھی کئی کئی روز گھر سے باہر رہنے کی وجہ سے صورت حال سے لاعلم تھا۔

پینجے کا بیٹا پانچ برس کا ہو کر سکول جانے لگا تھا۔ ماں کی زندگی میں یہ پہلا اور انوکھا تجربہ تھا کہ وہ ماں کی حیثیت سے اسے روزانہ تیار کر کے سکول بھیجتی وہ اس کے لئے رنگارنگ کپڑے بناتی۔ سردیوں میں بیٹے کے لئے سویٹر، جرابیں گرم اور ٹوپی بنتی۔ اور گرمیوں میں ٹینس کالر قمیض اور نیکر۔ موسم کے اعتبار سے اس کے لئے ہاف بوٹ یا سینڈل خریدتی۔ سر پر ہیٹ اور گلے میں کتابوں کا بیگ۔ پینجے کا بیٹا اس سج دھج کے ساتھ سکول جاتا جیسے کسی نمبردار کا بیٹا ہو جب وہ سکول سے لوٹتا تو اسے کھانا کھلانے سے پہلے شربت یا چائے ضرور

بلاتی پینچے سے کہہ کر اس کے لئے چھوٹی سی کرسی اور میز منگوائی تاکہ وہ اس پہ بیٹھ کر کھانا وغیرہ کھلائے۔ وہ یہی کہا کرتی کہ اس کا بیٹا بڑا ہو کر بابو بنے گا۔ اس لئے اگر اسے ابھی سے میز کرسی پر بیٹھنا نہ آیا تو پھر کب آئے گا۔

وہ خود تو چٹی ان پڑھ تھی مگر سونے سے پیشتر اپنے بیٹے سے سبق، پہاڑے اور گنتی سنانے کو کہتی۔

وہ بیٹے کی پڑھائی میں اور پرورش میں اس حد تک مشغول رہنے لگی تھی کہ گاؤں کا نمبردار اسے دیکھ کر حسد کرنے لگا تھا۔ کیونکہ اس کی نمبردارنی اپنے بیٹے کو گھر کے کاموں میں لگائے رکھتی تھی۔

پینچے کی بیوی اپنے بچے کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ لچوں، لفنگوں کے ساتھ بھی یاری لگائے ہوئے تھی۔

ایک روز وہ اپنے آشناؤں کے ہمراہ رنگ رلیاں منا رہی تھی کہ پینچا خلافِ معمول گھر لوٹ آیا۔ کمزور آدمی تھا اس لیے لفنگوں سے ڈر گیا مگر رات کے اندھیرے میں اپنی بیوی کو چٹیا سے پکڑ کر گھر سے نکال باہر کیا۔۔۔ وہ شراب کے نشے میں دھت تھی۔ جب اس کا نشہ اُترا تو اس نے خود کو ایک تیز رفتار ریل میں بیٹھے پایا جو کسی نامعلوم سمت کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے دائیں بائیں دو مشٹنڈے رکھوالوں کی طرح بیٹھے تھے جیسے اسے جیل لے جا رہے ہوں۔

اس بازار میں پہنچ کر وہ ایک بار بِک گئی۔ مگر جلد ہی اس نے فروخت کرنے والوں سے چھٹکارہ پالیا اور اپنے لئے اس بازار میں الگ ٹھکانہ بنا لیا۔

یہ ٹھکانہ اس نے ایک ایسی کوٹھڑی میں بنایا، جسے میونسپلٹی والے خطرناک

قرار دے کر گرانے کا حکم دے چکے تھے۔ مسلسل دھار بارشوں میں آس پاس کی کوٹھڑیوں کی چھتیں گر چکی تھیں۔ اس کوٹھڑی کی دیواریں بھی کبڑے کی طرح مڑ چکی تھیں اور پرانی چھت کسی وقت بھی ڈھے سکتی تھی۔

جب اس نے کوٹھڑی کے تھڑے پر کھڑے ہو کر دیمک زدہ دروازے کو دھکا دیا تو ایک پٹ الگ ہو کر اندر کی طرف گر گیا۔ دروازہ کنڈی اور تالے سے بے نیاز تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح پٹوں کو بھیڑ کر بیٹھ گئی۔

مالک مکان نے جب اسے خبردار کیا کہ کوٹھری تو گرنے والی ہے تو اس نے برجستہ جواب دیا۔

"میں بھی تو خودکشی کی نیت سے یہاں آئی ہوں۔"

سمجھدار مالک نے اس سے کرایہ پیشگی لے لیا اور اس نے اپنا دھندہ شروع کر دیا۔ چند دنوں کے اندر اس نے پانی کا گھڑا، فرشی دری، ایک چارپائی، کپڑے رکھنے کی الماری، صندوق، سنگھار میز اور ضرورت کی دوسری چیزیں خرید لیں۔ دیواروں کی بدصورتی دور کرنے کے لئے اس نے پرانے کیلنڈر اور فلموں کے اشتہاری پوسٹر وہاں لٹکا دیئے۔

پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ ہمیشہ اس بازار کی دوسری عورتوں کا کاروبار ہو گا مگر اس کی ضرورت تھی۔ اس کی کوٹھڑی میں ہر وقت کوئی نہ کوئی آیا رہتا۔

ایک روز اچانک خبر سنی کہ معلوم نہیں اسے کیا ہو گیا ہے۔ وہ اپنی کوٹھڑی کے تھڑے سے چھلانگ لگا کر اتری اور کوٹھری کی جانب منہ کر کے دونوں ہاتھ سر سے اونچے کر کے بازار والیوں کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"لوٹ لو ــــ لوٹ لو ــــ جو کچھ اس کوٹھری کے اندر ہے سب لوٹ کر لے جاؤ۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میرے لئے یہ چیزیں بے کار ہیں جنہیں ضرورت ہے، لے جائے۔"

چند لمحوں کے اندر اندر دائیں بائیں سے کسبیوں کے نوکر، دکاندار، راہ گیر، بھلے مانس کوٹھری میں گھس آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کوٹھری کو گنجے سر کی طرح چٹیل میدان بنا گئے۔ یہاں تک کہ کوٹھری سے گھڑونچی اور کموڈ بھی لوٹ لیا گیا۔ کسی نے اس سے یہ نہ پوچھا کہ آخر ایسا کیوں کر رہی ہو۔ دماغ تو نہیں پھر گیا۔ مت تو نہیں ماری گئی۔

سب کچھ لٹا کر وہ اس بازار سے باہر آگئی۔ بازار کے دوسری جانب شریف شہریوں کے مکان ایستادہ تھے۔ ایک میں کوچوان رہتا تھا جو اس محلے کا سب سے بڑا جھگڑالو، آوارہ، نشئی، جواریا، کمینہ، شوہدا اور لفنگا تھا۔ اس نے جھٹ اس کے ساتھ نکاح کر لیا۔ وہ اسے روز مارتا بلکہ اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا۔ اکثر اوقات وہ انتہائی غصّے کے عالم میں اسے چٹیا سے پکڑ گھر سے بھی نکال دیتا۔ اور دروازے کو تالا لگا کر خود معلوم نہیں کہاں چلا جاتا۔ مگر رات کے پچھلے پہر جب واپس آتا تو وہ مکان کے آگے بیٹھی ملتی۔ وہ نشے میں مدہوش ہوتا۔ یہ اس کی جیب سے چابی نکالتی، سہارا دے کر اسے اندر لے جاتی ساری ساری رات اس کی ٹانگیں دابتی۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ پاس پڑوس کے لوگوں سے مانگ کر اس کے لئے کھانا بھی تیار کر کے رکھ چھوڑتی۔ یہ ڈرامہ ہر روز کھیلا جاتا پر یہ کوچوان کو چھوڑ کر نہ جاتی۔ لوگ حیران تھے کہ اس بازار کی کھاتی پیتی

اور کئی دلوں کی دھڑکن اپنا دھندہ چھوڑ کر کیوں ایک بے قدرے شخص سے منسوب ہو گئی ہے۔

ایک روز وہ مارکھا کے گھر کے سامنے گلی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی اُڑی اُڑی رنگت اور سوکھے ہونٹوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھوکی ہے۔ میں نے کباب والے سے چار نان اور پانچ سات کباب لے کر رومال میں باندھے اور اس کے پاس لے جا کر خوشامدانہ لہجے میں کہا:

"کچھ کھا لو، لگتا ہے تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔"

وہ دوپٹے کو سر سے منہ تک ڈھلکاتے ہوئے بولی۔

"بھائی جان! آپ زحمت نہ کیجیے، میں خود ہی کھا لوں گی، وہ اب آتے ہی ہوں گے۔"

مجھے اچھی طرح علم تھا کہ آنے والا ہمیشہ کی طرح رات کے پچھلے پہر ہی آئے گا اور اسے کھانا کھلانے کی بجائے وہ خود اس کی روٹی کا محتاج ہو گا۔ اس لیے اصرار کر کے میں نے اس کے ہاتھ میں نان کباب تھما دیئے اور کبابیے سے ایک گلاس پانی لے آیا۔ اس نے ایک نان، ایک کباب اپنے لئے رکھ لیا اور باقی لپیٹ کر الگ کر لئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ آنے والے کی خدمت کرنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ وہ مکان کے تھڑے پر بیٹھ کر نظریں نیچی کر کے کھانا کھانے لگی۔ میں بھی تھڑے پر قریب ہی بیٹھ گیا۔ میں اس سے اس بن مانس اور گوریلے کے قبضے میں چلے آنے کا سبب دریافت کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ کھانا کھا کے، پانی پی کے "اللہ تیرا شکر ہے"، کہہ چکی تو میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"میری کہانی سُن کر کیا کرو گے"۔ ایک سرد آہ بھر کر وہ بولی۔

"یونہی —— اپنے دل کی تسلی کے لیے، کیونکہ جب کچھ پوچھنے کو جی چاہے تو نہ پوچھنے سے پوچھ لینا ہی اچھا ہوتا ہے"۔ میں نے کہا تو وہ اسی طرح نظریں جھکائے اپنی کہانی سُنانے لگی۔ ایک بار رُکی پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اسے تسلی دی تو وہ پھر گویا ہوئی۔ "اب وہ موڑ آتا ہے جس کی وجہ سے میں بازار سے اُٹھ کر یہاں آئی۔ پچھلا دھندہ ختم کر دیا۔

میری کھڑکی کے آگے سے سکول کے چند لڑکے گزرا کرتے تھے۔ یہ لڑکے چند کسبیوں کو چھیڑا کرتے۔ یہ کبھی مٹی کی پڑیا ہماری کوٹھڑی میں پھینک جاتے، کبھی پتھر مار کر گھڑا پھوڑ جاتے اور کبھی حُقّے سے چلم اُٹھا کر لے بھاگتے۔ ان لڑکوں میں ایک لڑکا ایسا بھی تھا جو شرارتی نہیں تھا۔ وہ ہماری کوٹھڑی میں مٹی کی پڑیا پھینکتا اور نہ ہی پتھر مارتا۔ ایک دفعہ میں نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔ پہلے تو وہ نہ آیا لیکن جب ایک دو بار پھر اشارے سے بلایا اور باقی لڑکے چلے گئے تو وہ میرے قریب آن کھڑا ہوا۔ میں نے اس سے پوچھا:

"کس جماعت میں پڑھتے ہو؟"

"نویں میں"۔ اس نے جواب دیا

وہ دوہرے جسم کا نازک اندام، بھولے بھالے، گول مٹول چہرے کا مالک تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کا حلیہ بالکل میرے بیٹے سے مشابہ ہے۔ اس کی آنکھیں ذرا چھوٹی اور ناک معمولی سا چپٹا تھا۔ میرے بیٹے کی آنکھیں بڑی اور چمکیلی، ناک کھڑا اور تلوار کی دھار کی طرح پتلا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا

کہ میرا لال بھی نویں میں ہو گا۔

اس لڑکے کو دیکھ کر یوں لگا کہ جیسے دُودھ میرے پستانوں میں دوبارہ اُتر آیا ہو۔ مَیں نے لڑکے سے کہا "کچھ کھا پی لو"۔ کہنے لگا "نہ"۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ وہ جا رہا تھا تو میری نظریں اس کی پشت پر تھیں۔ جب تک وہ اوجھل نہ ہو گیا۔ میری نظریں اس پر لگی رہیں۔

اگلے روز اس کی آمد سے پہلے مَیں نے مٹھائی منگوا کر رکھ لی۔ اس نے گزرتے ہوئے میری جانب دیکھا تو مَیں نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ اس نے کھڑے کھڑے مٹھائی کھائی اور چلا گیا۔ اب تو اس کا انتظار میرا معمول بن کر رہ گیا۔ اس کے کھانے پینے کے لئے روزانہ کچھ نہ کچھ رکھ چھوڑتی۔ کبھی کوئی میوہ، کبھی مٹھائی، کبھی شربت کا گلاس، کبھی چائے، بسکٹ یا کیک پیسٹری۔ ایک بار مَیں نے اُسے چھٹی کے روز بلایا۔ مَیں اس روز بہت خُوش تھی۔ صُبح سویرے غُسل کر کے کپڑے پہنے، دو رکعت نماز پڑھی۔ بازار سے سودا لا کر اس کے لئے کوفتے بنائے، انڈوں کا حلوہ اور خمیری روٹی پکائی، دُودھ، دہی، مکھن، بادام اور بھُنا ہوا پستہ اس کی تواضع کے لئے تیار کیا۔ وہ آیا تو مَیں نے دروازہ بھیڑ لیا اور اپنے ہاتھ سے لقمے اُس کے منہ میں ڈالنے لگی۔ اس نے پیٹ بھر کر تمام چیزیں کھائیں اور ہنسی خوشی گھر چلا گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مَیں نے اپنے ہی بیٹے کے لئے کھانا پکایا ہو جو مجھ سے ایک مدت کی جُدائی کے بعد ملا ہو۔ اس روز مَیں خوشی سے پھُولے نہیں سماتی تھی۔ بازار کی دوسری کسبیاں مجھ سے پوچھتیں:
"کیا بات ہے؟ آج تو تیرا منہ بغیر سرخی کے لال اور چھاتیاں انگیا کے بغیر

اٹھی ہوئی ہیں۔" میں نے کہا "میں تمہیں بتا بھی دوں تو تم نہیں سمجھ گی۔"

وہ اسی طرح روز آتا رہا اور مجھ سے مل کر چلا جاتا۔ وہ جان بوجھ کر اپنے ساتھیوں کے بعد آتا تھا۔

ایک بار وہ خلافِ معمول دن کے وقت نہ آیا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ طرح طرح کے وہم آنے لگے۔ اللہ! میرے لال کی خیر ہو۔ مالک! اس کا بال بیکا نہ ہو میں نے اس کے لئے ہزاروں دعائیں مانگیں۔ سینکڑوں منتیں مانیں۔ شام کے وقت وہ آیا اور چھلانگ لگا کر تھڑا پھلانگ کر کوٹھڑی میں آگیا۔ میں جلدی سے اُٹھ کر اس کے پیچھے آئی۔ اس نے خود ہی دروازہ بھیڑا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا سا تھا۔ چہرے کی رنگت بھی اُڑی اُڑی تھی۔ میں نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھا اس کا دل تیزی سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر کرسی پر بٹھایا۔ اس کے ہاتھ برف کی مانند یخ تھے۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے سینے سے لگا کر پوچھا۔

"میرے لال! خیر تو ہے؟ تیرے ساتھ کوئی حادثہ تو نہیں ہو گیا؟" مجھے لگتا تھا جیسے وہ کسی حادثے سے بچ کر آ رہا ہو، ماں کی گود میں پناہ لینے کے لئے مگر ــــــ اس نے کانپتی ہوئی بانہہ سے مجھے پرے ہٹا دیا۔ وہ چپ چاپ کرسی سے اُٹھ کر میری کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ چائے دانی میں گرم چائے موجود تھی جو پیالی میں ڈال کر میں نے اس کے مُنہ سے لگا دی۔ وہ غٹا غٹ پی گیا۔ اس کے ہاتھ کا کانپنا بند ہوئے جیسے اس کا ڈر آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا ہو۔ اس نے

مجھے کھاٹ پر آجانے کو کہا۔ اس نے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ کبھی بھی میری کھاٹ پر نہیں بیٹھا تھا۔ مَیں کھاٹ پر بیٹھی ہوتی تو وہ کنی کترا کر نکل جایا کرتا میرے قریب نہ آتا۔ مَیں حیران تھی آج اسے کیا ہو گیا ہے؟ شاید وہ تھک گیا ہے اور آرام کرنا چاہتا ہے۔ شاید اس کا جی چاہتا ہے کہ مَیں اس کا سر دبا دوں۔

پَر اس وقت مجھ نصیبوں جلی کی حیرانی کی حد نہ رہی جب اس نے جیب میں سے تڑا مڑا ہوا پانچ روپے کا ایک میلا سا نوٹ نکال کر میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے میرے ازار بند میں ہاتھ ڈال دیا۔ مَیں تڑپ کر اس سے دور ہو گئی۔ بے حیا کہنے لگا۔

"کیوں! کیا مَیں مرد نہیں؟"

مَیں نے اسے دھکا دے کر تھڑے سے نیچے گرا دیا۔ وہ گرتا پڑتا بھاگ گیا اس کے پیچھے میں بھی کوٹھڑی سے نکل آئی اور پاٹوں پاٹ دروازہ کھول کر لوگوں کو آواز دی:

"لوٹ لو، لوٹ لو، یہ چیزیں میرے کسی کام کی نہیں۔"

بھائی جی! ان باتوں میں مَیں نے اپنی جوانی لٹا دی۔ اپنا ستر، اپنی حیا لٹا دی مگر مجھے اب نظر آیا ہے کہ بازار میں بیٹھ کر میرے اندر کی ماں بھی لُٹ چکی ہے۔ جسے مَیں نے بیٹا سمجھا، اس بازار میں مجھے وہ بھی ماں نہیں سمجھتا۔ صرف ایک عورت سمجھتا ہے۔ ایک کسبی، ایک خانگی سمجھتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ کسبی کی بے عزتی نہیں ہو سکتی۔ خانگی کی پت نہیں اُتر سکتی۔ پر اس بات کو سچ سمجھنا کہ اس دن کے بعد کسبی کی بے عزتی ہو گئی، خانگی کی پت اُتر گئی۔
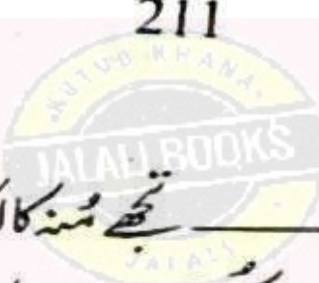
مَیں نے خود سے کہا ـــــــــ تجھے مُنہ کالا کرتے مدّت گزری مگر اصلی مُنہ کالا تیرا آج ہوا ہے - آج تیرا کُچھ نہیں رہا - نکل جا اس بازار سے -

مَیں اس بازار سے نکل آئی - اور اب ایک خصم کی ہو کر رہنا ہے - یہاں مجھے روز مار پڑتی ہے - لیکن مجھے کوئی ماں کہہ سکتا ہے ؟ کوئی بہن سمجھ سکتا ہے ؟"

فرخندہ لودھی

قصبے میں یہ پہلا جلوس نہ تھا پھر بھی لوگ ہراساں تھے لیکن تیلی کی لڑکی پھولاں اطمینان سے گدی پر بیٹھی، عجیب چٹ پٹے انداز سے بھنا ہوا گوشت کھا رہی تھی۔

اور کولہو چل رہا تھا۔

کولہو کی چوں چوں اور بیل کے گلے کی گھنٹی کی ٹن ٹن کے ساتھ ایک اور سُر کا اضافہ ہوا۔ سُو سُو۔ مرچوں کی جھال سے بولائی ہوئی پھولاں "ٹخ ٹخ" کی تال دینا نہ بھولتی تھی ورنہ بیل تھم جاتا اور سارے سُر دم سادھ لیتے۔

منّی روزمرہ کی طرح آج بھی ٹکٹکی باندھے کولہو کو گھومتے دیکھ رہی تھی۔ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے آئی تھی۔ پھولاں نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی وہ مسکراتی، مسالا چاٹتی، بڑی اپنائیت سے منّی کو دیکھ لیتی اور کولہو گھوم رہا تھا۔

منّی کو پھولاں وحشی درندہ دکھائی دیتی تھی حالانکہ وہ ہمیشہ پھولاں کو اپنی بہن قیصرہ سے کہیں زیادہ خوبصورت اور خوش مزاج سمجھتی تھی مگر آج اونٹ کا گوشت کھاتے ہوئے پھولاں نے اس کا یہ طلسم توڑ دیا تھا۔

"چھی"!

مُنّی نے مُنہ دوسری طرف کر کے تھوکا اور کھڑی رہی۔ اس پر ماحول کا سحر پھر طاری ہونے لگا۔ خاموشی میں گھنٹی کی ٹن ٹن اور دوسری ملی جلی آوازیں، کچے تازہ پتے فرش سے اٹھتی مٹی کی باس میں تیل، دھواں اور مشقتی بدنوں کے پسینے کی بُو گھُلی ملی، انتہائی سادہ اور مانوس۔ مُنّی کو یہاں آکر ہمیشہ سکون سا ملتا اور یوں محسوس ہوتا جیسے وہ زمین پر چل رہی ہو اور زمین ہی کی باسی ہو اور ایک جگہ رک گئی ہو۔ حالانکہ کولہو گردش میں ہوتا۔

کئی بار اس نے پھُولاں کی اجازت سے گدّی پر بیٹھ کر جھولے بھی لیئے اور ہر بار دوستی مستحکم سے مستحکم ہوتی گئی۔ لیکن آج بات کرنے تک کو دل نہ چاہ رہا تھا دن بھر کے واقعات اس کے ذہن سے کسی صورت محو نہ ہوتے تھے۔ پھُولاں نے پہل کی اور کٹوری سے بوٹی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کھاؤ گی؟" اور گھوم گئی۔

"چھی۔ گندا،"

مُنّی اپنی جگہ سے ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ پھُولاں بیل کو ہانکتے اس کے پاس سے گزری۔

"اونہہ۔ واہ"

پھر وہ گدّی سے کود پڑی اور بیل اپنے آپ آگے بڑھ گیا۔

پھُولاں، مُنّی سے عُمر میں خاصی بڑی تھی، لیکن دونوں کے درمیان بے تکلفی ہم جولیوں جیسی تھی جس پر مُنّی کے گھر والوں کو ہمیشہ اعتراض رہتا۔ مُنّی کو پھولاں

سے زیادہ اس گھمبیر، پُرسکون ماحول سے دلچسپی تھی جس سے اسے احساس ہوتا
کہ ہر چیز زمینی ہے۔

پُھولاں نے بوٹی اس کے بند ہونٹوں پر رگڑ دی۔ مُنّی کشمکش کے عالم
میں بھٹی پر گرتے گرتے بچی اور موٹی اوڑھنی سے مُنہ رگڑتے ہوئے کہا:

"گندا۔ گندا"

پھُولاں نے گوشت کا ٹکڑا اپنے مُنہ میں ڈالا اور زور زور سے دو چار دانت
مار کر نگل لیا۔

"گندا کیوں؟ تم مسلمان نہیں ہو؟"

"واہ، مسلمان کیوں نہیں"

گویا مُنّی کی ہتک ہو گئی۔ یہ فقرہ گالی تھا جسے مُنّی قبول نہ کر سکی۔

"ہم ..... ہم .....،" مُنّی کو اچانک اپنی برتری کا احساس ہوا۔

"تو پھر تم اونٹ کا گوشت کیوں نہیں کھاتے؟" پھولاں دلیل چاہتی تھی۔

"گندا ہوتا ہے"

مُنّی کے پاس کوئی وضاحت نہ تھی اور پھر اُسے تھوکنے کی جلدی بھی تھی۔

پھُولاں نے مُنّی کے جواب کو دہرایا۔ !

"گندا ہوتا ہے۔ کون کہتا ہے گندا ہوتا ہے؟ اس کا کھانا سنّت ہے"

مُنّی ہونق سی کبھی پھُولاں اور کبھی چلتے کولہو کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی مذہبی
معلومات لفظ سنّت پر آ کر ختم ہو جاتی تھیں۔ سنّت کے حوالے سے لوگوں کو
مختلف قسم کی باتیں کرتے دیکھ کر مُنّی کو اس لفظ کے معنی کا سرا نہ ملتا تھا ابھی

تھوڑی دیر پہلے اماں نے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا ۔

" انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونے کی کوشش جہاد ہے اور جہاد فرض ہے اور سنت ہے ۔"

پچھواڑے گھر میں کمسن لڑکے کی سُنتیں ہو گئی تھیں اور جراح کو سونے کی چڑیا اُڑا کر لڑکے کی سُنتیں کرتے اس نے خود دیکھا تھا اور نیلی کی اُجڈ لڑکی کہہ رہی تھی کہ اونٹ کا گوشت کھانا سُنت ہے ۔

مُنّی کو متلی سی ہونے لگی ۔ دوپہر سے اب تک طبیعت اُوپر نیچے ہو رہی تھی ۔ اُس منظر کو ہزار کوشش کے باوجود بھلایا نہ جاسکتا تھا ۔

❖

کھیتوں کے بیچوں بیچ اونٹ کا بوٹی ساڈھانچا اب بھی پڑا تھا ۔ گوشت اور ہڈیوں کی لال حویلی جس پر کوّے ، کُتے ، بچّے منڈلا رہے تھے اور چیلیں اُوپر ہی اُوپر چلاّتی نیچے غوطہ لگا کر جھپٹتیں ، اِدھر سے اُدھر نکل جاتی تھیں ۔

دوپہر ڈھلے کافی دیر ہو چکی تھی ۔ پھُولاں نے ایلومینیم کی کٹوری میں آخری بار اُنگلی پھیر کر چاٹی اور کٹوری چولہے کی مینڈھ پر رکھتے ہوئے کہا ۔

" مُنّی ، تو تھوڑی دیر کو یہاں کھڑی ہو ۔ بیل ہانکتی رہنا ۔ میں تھوڑا سا گوشت اور کاٹ لاؤں ۔"

وہ مُنّی کی ہاں یا ناں کا انتظار کئے بغیر ، کندرا جھاڑتی چل دی ۔ مُنّی نے کندورے سے جھڑتی ہوئی بے شمار چیونٹیوں کو زمین پر رینگتے دیکھا ۔ اس کے اعصاب کانپ اُٹھے اور دوپہر کا وہ منظر یاد آیا جب گوشت کی لال حویلی کے گرد

جسموں کا جیتا جاگتا جلوس رینگتا پھرتا تھا۔

آج جمعہ کا روز تھا، اس لیے سکول میں جلدی چھٹی ہو گئی تھی اور شہر میں افواہ تھی کہ نمازِ جمعہ کے بعد جلوس نکلنے والا ہے۔ مُنّی تیز تیز چلتی گھر کی طرف آ رہی تھی کہ کھیتوں کے بیچوں بیچ انسانوں کا جمگھٹا نظر آیا۔ اس کے چھوٹے سے ذہن نے سوچا، شاید جلسہ ہو رہا ہے اور جلوس نکلنے والا ہے۔ وہ مجمع کو دیکھنے کی غرض سے آگے بڑھی۔ عجیب نظارہ تھا۔ لوگ چاقو چھریاں ہاتھوں میں لیے کچھ کاٹ رہے تھے۔ گاہے گاہے اس کے پاس سے گزرنے والا اس قسم کا فقرہ کہہ کر نکل جاتا۔

" اونٹ کٹا ہے —— اونٹ کٹا ہے "

مُنّی مجمع میں شامل ہو گئی۔ جانے ادھر کیا تھا وہ دیکھ نہ سکتی تھی۔ گالیاں چیخ پکار، دھکم پیل۔ کھیت کی مینڈھ پر چڑھ جانے سے بھی مقصد حاصل نہ ہو سکا۔ وہ تختی کا سایہ سر پہ کئے ہر ایک کو حیرت سے تک رہی تھی کہ اس کے محلے کا چھوکرا فیروز شاہ دور سے للکار کر بولا۔

" اری مُنّی تو یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے؟ گوشت لے گی؟ بستے میں باندھ لے ایمان سے اونٹ کٹا ہے۔ یہ بڑا۔ مُفت "

اس وقت مُنّی کو معلوم ہوا کہ لوگ چاقو چھریاں کیوں لئے پھرتے ہیں۔ دوسرے لمحے مُنّی فیروز شاہ کے پاس کھڑی تھی۔ فیروز نے اونٹ کی گردن پر قبضہ جما رکھا تھا اور وہ مجمع سے کہہ رہا تھا۔

" ادھر کوئی نہ آئے۔ جو کوئی آیا اس کی ...."

کسی نے پوچھا۔ " شاہ جی، آپ بھی؟ "
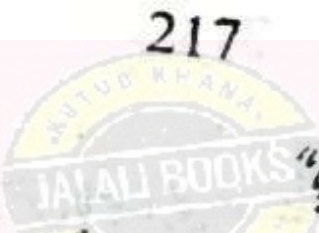
"کیوں ؟ ہم کیوں نہیں ؟"

فیروز انہماک سے کام میں مصروف تھا۔ منّی نے دیکھا۔ ایک ہٹا کٹا نوجوان اُونٹ کے پیٹ میں بیٹھا کسی کو قریب نہیں پھٹکنے دیتا۔ یہ برکت تھا۔

"چل اوئے۔ باری باری آؤ۔"

اس کے ہاتھ لال بوٹی ہو رہے تھے۔ اچھی اچھی بوٹیاں کاٹ کر وہ اُونٹ کے سینے میں پھینکے جاتا تھا۔ گردن سے گوشت نوچنے والے یہ نہ جانتے تھے کہ رانوں پر سے کتنا بچ چکا ہے۔ البتہ فتح فوج کر ہاتھوں ہاتھ جان پہچان والوں کو پہنچا دیتے تھے۔ لطیف میراثی یہاں کھڑا بھی اپنی زندہ دلی اور ذہانت سے لوگوں کو ہنسائے جاتا تھا۔

' او باشاہو، اینھے شاہواں دے گھر نیئں بھر دے۔ اسی نال مارے بھجے کھیتیں آں۔' اس نے فیروز کو مخاطب کر کے کہا:

' شاباشے! شاہ جی، ذرا کھلا ہتھ مارو۔'

پھر کسی نے پوچھا۔ "یہ خان کی لڑکی کیوں کھڑی ہے؟ گوشت نہیں لینا تو جگہ خالی کرے۔ چل لڑکی۔"

منّی لرز گئی۔

" بڑے گھر کی لڑکی ہے۔ یہ نہیں لے جائے گی۔" بیبھاں سقن نے، کندورے پر چاقو صاف کرتے ہوئے کہا۔ فیروز نے منّی کی طرف عجیب تلملاہٹ سے دیکھا:

" اُونہہ! بڑے گھر کی۔"

مگر منّی فیروز سے یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ اس قدر بڑا اُونٹ کٹا کیسے؟ اور

کٹا تو یوں کیوں پھینک دیا کہ جس کا جتنا جی چاہے گوشت نوچ لے ۔ اتنے میں پھولاں جھینپتی مسکراتی گلابی شباب پر شبنمی پسینا سجائے بھیڑ میں آ شامل ہوئی ۔ ادھیڑ عمر کریم جولاہے نے برکت کو آنکھ ماری ۔

" آگیاں سرکاراں "

دیکھتے ہی دیکھتے پھولاں کا کندورا گوشت سے بھر گیا ۔ مجمع میں کھڑی عورتوں نے نفرت اور حیرت سے دیکھا اور بڑبڑائیں ۔ جانے وہ کیا کہہ رہی تھیں ۔ پھولاں کی بلا سے ۔ وہ تو گامے سنتری کے ساتھ جھینپ جھینپ کر باتیں کر رہی تھی ۔

گامے نے اپنا خاکی تھیلا کسی کو پکڑا دیا ۔ وہ بڑے رعب سے پھولاں اور دوسری لڑکیوں کو بتا رہا تھا ۔

" آپ ہی بھریں گے سالے اور ہاں بانو تم سری پائے لے جاؤ "

کمسن بانو جو ابھی ابھی وارد ہوئی تھی ۔ گامے کی رائے پر سکڑ سی گئی ۔ پھولاں نے اس کی کمر پر دھپ جماتے ہوئے کہا ۔

" کہاں بوٹی بوٹی جمع کروگی ۔ سری پائے ہی لے جاؤ "

بانو ہولے ہولے سرکتی اونٹ کے پاس پہنچ گئی ۔ گامے نے اس کے رویے کو سراہا ۔ اسی لمحے چھیماں سقن کی ٹانگوں میں کسی نے اڑنگی دی اور وہ لڑکھڑا کر گری ایک قہقہہ بلند ہوا ۔ پھر شور ، گالیاں ، فضیحتے اور چھیماں کی چیخیں ۔ جانے کس کے جوتے کی نوک اس کے بدن کو کچلے جاتی تھی اور وہ کون تھا جو اس کے بازو پر یہ بڑا چھیچھڑا بھر گیا ۔

" ماں دیا ۔ ۔ ۔ ۔ "

وہ پاس کھڑے نوعمر لونڈے پر پھبتی۔ اس سے پیشتر کہ وہ دوسرا تھپڑ رسید کرے ، ایک بوڑھی مردانہ آواز آئی۔

"جہاں مرد ہوں وہاں عورتوں کا کیا کام"

"جہاں جوان ہوں وہاں بوڑھوں کا کیا کام" چھیماں کی بجائے لطیف مراثی نے جواب دیا۔

اس پر زور کا ٹھٹھا لگا۔

"واہ وا طفیلے"

دوسرے ہی لمحے لطیف کا گریبان ایک نوجوان کے ہاتھ میں تھا اور جبڑوں پر گھونسوں کی بوچھاڑ۔ لطیف کے مُنہ سے خون کی دھار بہہ کر اُونٹ کے گوشت پر بکھر گئی۔ لوگوں نے خون دیکھا تو گامے کو رپورٹ کی لیکن گامے نے وہیں کھڑے کھڑے للکارا۔

"بلّے بھئی! باہر آکر لڑو۔ شیدے ، دیکھ میرا تھیلا اِدھر اُدھر نہ ہو جائے"

شیدے نے دور ہی سے بھرا ہوا تھیلا فضا میں بلند کیا۔ گامے کی نگاہوں میں اطمینان تھا ، لطیف اور دوسرا نوجوان گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ گامے نے شیدے کو گھر بھیج دیا اور خود ہنٹر ہلاتا مجمع میں گھس گیا۔ اس کی غلیظ گالیوں سے لڑکے محفوظ ہو رہے تھے اور عورتیں شرما کر سر نیہوڑائے زیادہ انہماک سے گوشت کاٹنے میں مصروف تھیں۔ لطیف شاید تھک چکا تھا یا کپڑے تار تار ہونے کی وجہ سے میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ اب لوگ اس کے پیچھے تالیاں بجا رہے تھے دوسرے نوجوان نے بڑکیں مارتے ہوئے لطیف کی جگہ سنبھال لی۔

فیروز نے پکارا تو منی کو احساس ہوا کہ وہ اب تک وہیں کھڑی ہے۔ فیروز نے اسے گھر جانے کے لئے کہا تو وہ بغیر فیصلہ کئے چل دی۔

گھر پہنچ کر منہ ہاتھ دھوتے ہوئے بہت سا پانی پیا۔ بڑی بہن قیصرہ نے روٹی کے لئے پوچھا تو وہ اپنے ہی خیالوں میں بولی:

"ہاں ہاں آپا نکال دیجئے۔"

منہ میں نوالا ڈالا تو یوں لگا جیسے وہ کچے گوشت کا لوتھڑا چبا رہی ہے اور اس میں لطیف کا نمکین خون رچا ہے۔ وہ لقمہ چھوڑ کر اٹھ بھاگی اور نالی پر جا کر قے کر دی۔ قیصرہ اس کے سر پر کھڑی پریشان تھی۔

"کمبخت خالی پیٹ اتنا پانی کیوں پیا ہے۔" اماں صحن میں بکتی چلی آئیں۔

"اے ہے لُو لگ گئی۔ جانے کہاں دھوپ میں گھومتی رہی۔ بخار چڑھے گا۔"

"نہیں اماں نہیں۔ اونٹ" وہ قے کرتے ہوئے بتایا کی۔ "اماں، اونٹ۔"

"اللہ ماری کیا اوٹ پٹانگ بکتی ہے۔ قیصرہ اسے کلی کرادو۔" اماں آپا کو حکم دیتیں واپس کمرے میں چلی گئیں۔

دوپہر کو وہ شست سی ہو کر ماں کے ساتھ لیٹی تھی۔ ماں نے پنڈا چھوا اور ڈانٹ کر پوچھا۔

"کیا کھایا تھا سکول میں؟"

"اونٹ" وہ غنودگی کے عالم میں بولی:

"کیا بکتی ہے؟" اماں نے اسے پرے دھکیل دیا اور پنکھے سے ہوا کرتے

گئیں۔ منّی نے واقعہ سنانا شروع کیا تو وہ بیچ میں بولیں۔

" اری یوں کہہ نا! کریمن کا چھوکرا بتا گیا ہے۔ قافلے والے اونٹ کو ذبح کر کے ڈال گئے ہیں "

قے کے بعد منّی کی طبیعت نڈھال سی تھی۔ اماں سے واقعہ سنتے سنتے اسے نیند آ گئی۔

سورج درختوں اور مکانوں کی چوٹیوں سے پھسلا تو بچوں کے بھاگوں سرپہر ہو گئی۔ منّی گھر کے سب افراد کو سوتا چھوڑ کر باہر آ گئی۔ کھیتوں میں مکمل خاموشی تھی۔ کہیں سے رہٹ چلنے کی آواز آ رہی تھی یا پھولاں کا کولہو اپنی چوں چوں سے سکوت توڑ رہا تھا۔ یقیناً پھولاں گدی پر بیٹھی ہو گی، منّی نے سوچا اور اس طرف چل دی۔ اب گھنٹی کی ٹن ٹن صاف سنائی دیتی تھی اور پھر بیل کی لمبی لمبی سانسیں۔ پھولاں گدی پر بیٹھی ایلومینیم کے کٹورے میں سے کچھ کھا رہی تھی۔ کولہو چل رہا تھا، انتہائی سادہ اور دلفریب طریقے سے۔

منّی دیکھتی رہی۔ کولہو چلتا رہا اور پھر ایک دن پاکستان بن گیا۔

⁂

اماں ہر بار منّی کا بازو کھینچ کر بھیڑ میں کر دیتی لیکن منّی لڑھکتی، دھکے کھاتی، کچی سڑک کے کنارے آ جاتی۔ ہزاروں قدموں سے اڑتی گرد میں اس کا دم گھٹتا تھا پھر ڈھلتی عمر کے مرد اور نوعمر چھوکرے چلتے چلتے جانے کیوں چٹکیاں کاٹتے تھے۔ وہ بلبلا کر قافلے سے باہر آ جاتی۔ وہ تو یہ بات ماں یا آپا کو بتانے سے کترا رہی تھی۔ حیا اور نفرت کا عجیب سا احساس تھا کہ کچھ کہا نہ جا سکتا تھا۔

"تجھے ضرور سکھ لے جائیں گے حرام زادی! کنارے پر مت چل۔"

ماں نے ایک دو ہتڑ کمر میں دیا اور چٹیا پکڑ کر کھینچی۔ منی کے سر پر سے گٹھڑی گرتے گرتے بچی۔ وہ ماں کے چہرے کے تاثرات دیکھنا چاہتی تھی کہ انہوں نے اس سے پیشتر کبھی ایسی گالی نہ دی تھی۔ یہ آج انہیں کیا ہو گیا تھا۔

جیپ پر سوار فوجیوں کا دستہ شاید سویں بار ان کے قریب سے گزرا "سب ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔"

پیغام دیتے وہ آگے بڑھ گئے۔ قصبے کے لوگ، جن کے پاس رائفلیں اور ہتھیار تھے، کچھ پیدل، کچھ گھڑ سوار قافلے کی حفاظت کر رہے تھے۔ وہ میرِ کارواں کا پیغام سناتے ایک طرف سے دوسری طرف نکل جاتے۔

"مرد کنارے کنارے چلیں۔ کیمپ دور نہیں۔ حملہ ہو جائے تو جان و مال کی پرواہ نہ کرنا۔ اپنی عزت بچانا۔" گھڑ سوار پیغام سناتا گزرا۔

عورتیں مزید سمٹ گئیں۔ مرد زیادہ پھیل گئے۔ اسی لمحے اگلی ٹکڑی میں شور پیدا ہوا۔ منی کا دل دہل گیا۔ قیصرہ نے اُسے قریب کر لیا۔

"کیا ہوا؟" کئی عورتوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

"کچھ نہیں۔" مرد ہنس رہے تھے۔

چند قدم چلنے کے بعد انہیں پھولاں اور اس کا باپ مل گئے۔ پھولاں سر پر صندوق اور اس کے اوپر گٹھڑی کو دونوں ہاتھوں سے تھامے بک رہی تھی "کنجر"

بوڑھے نیلی نے ابا سے درخواست کی "خان صاحب، پھولاں کو بیبیوں

کے ساتھ کر دوں ۔ لوگ شرارتیں کرتے ہیں۔"

پھر اُس نے اپنی بیٹی کو متنبہ کیا "دیکھ ! قافلے سے باہر نہ آنا۔"

بوڑھا اپنی کمر پر لبستر سنبھالتا ، آگے آگے چلنے لگا ۔ پھولاں نے ایک نئی گالی گھڑی ۔

" ماں دے ....."

"کیا ہوا پھولاں ؟" ماں نے پوچھا ۔

" بی بی ، میرے تن توں بوٹی توڑ کے لے گیا ۔"

"کون ؟" قیصرہ کا سوال بے ساختہ تھا ۔

" کی پتا کون سی ... ماں ....."

قیصرہ ہنسی روک نہ سکی ۔ مُنّی نے وثوق سے سوچا، آپا اور امی کو کسی نے نہیں چھیڑا تبھی اطمینان سے چل رہی ہیں ۔" اسی اثنا میں گھڑ سوار آواز لگاتا آیا :

" ہوشیار ! اکالی دل کے نعرے سنائی دیتے ہیں ۔"

لوگ ایک دوسرے پر گرنے لگے ۔ مُنّی آپا اور اماں کے درمیان آگئی ۔ آپا کے پاؤں ٹھیک نہ پڑتے تھے اور اماں کا بُرقعہ سر سے آدھا کھسک گیا ۔

" گھبراؤ نہیں ۔ آرام سے چلو ۔" خود ابا کی آواز میں گھبراہٹ تھی ۔

رفتہ رفتہ شام کا جھٹپٹا اور چاندنی ایک ہو گئے پھر چاندنی بکھری تو فاصلوں کا اندھیرا کم ہو گیا ۔ قافلہ چلتا رہا ۔ پیغامات آتے جاتے رہے ۔ کھیت پُرسکون تھے ۔ خوف اور رات کی خنکی سے کمزور بدن کانپ رہے تھے مگر چل رہے تھے ۔

" ست سری اکال !"

اگلے کھیتوں کی پگڈنڈیوں میں شعلوں کا میلہ سا لگا تھا ۔ دیکھتے ہی دیکھتے قافلہ اس کی لپیٹ میں آگیا ۔ بھگدڑ، گولیاں، کرپانیں، برچھیاں، چیخیں، نعرے اور رحم کی درخواستیں ۔ اُف منّی کی گٹھڑی جانے کہاں لڑھک گئی ۔ وہ اماں کے بُرقعے میں گھُسنا چاہتی تھی ۔ایک بار اس کے سکول میں خارش زدہ لال بوٹی سا باؤلا کُتا گھُس آیا تھا تو اسی طرح آپادھاپی پڑ گئی تھی ۔ اس کے بہت قریب گولیاں چلیں ۔جسم گرے اور کہیں دُور سے پھولاں کی آواز سنائی دی ۔

"ابا"!

مگر پھولاں کے ابا کو اس نے زمین پر گرتے ابھی ابھی دیکھا تھا ۔ وہ آگے بڑھ آئی تھی ۔اماں نے اسے پرے دھکیل کر قیصرہ کو ساتھ لگالیا ۔منّی ماں کے رویے کو تلخی سے محسوس کرتی چلتی رہی ۔

"اونہہ! اماں کو آپا بہت پیاری ہے"۔

دوسرے ہی لمحے اس نے کسی کو رو رو کر پکارتے سُنا:

"منّی! میری منّی!"

یہ اس کی ماں کی آواز تھی اور وہ کسی جن کے مضبوط بازوؤں میں جکڑی جانے کہاں جا رہی تھی ۔

⁂

پاکستان میں آئے ہوئے منّی کو سترہ اٹھارہ برس بیت گئے ۔تلاشِ بسیار کے بعد اسے پتہ چلا کہ اس کا باپ راستے ہی میں قتل ہو گیا تھا ۔قیصرہ کی شادی کیمپ میں کسی دُور کے رشتے دار سے کر دی گئی تھی ۔ ماں اسی کے

پاس رہتی ہے ۔ قیصرہ کے بچے جوان ہو گئے ہیں ۔ لیکن ماں مُنی کو روتے روتے اندھی ہو چکی ہے ۔ مُنی کے تصور میں ایک بھرا پُرا گھر اُبھرتا ۔ وہ اس گھر میں جا نہ سکتی تھی کہ خود اُجاڑ تھی ۔

پھر ایک دن حکم آیا کہ بازار خالی کر دو صرف گانے بجانے والیاں ہی رہ سکتی ہیں ۔ مُنی کو ذرا بھی تشویش نہ ہوئی ۔ یہ مسئلہ اس کا نہ تھا ۔ ہر رات چھاپے پڑتے تھے ۔ ان کی مالکہ غفوراں بہت ہراساں تھی ۔ وہ ہر صبح رات خیر خیریت سے بسر ہو جانے پر نیاز بانٹتی تھی ۔ اگرچہ آمدنی بہت گھٹ چکی تھی ۔ ہاں گانے بجانے والیوں کے گھروں کی رونق پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی ۔ رفتہ رفتہ کئی مکان خالی ہو گئے ۔

" لو آج ماجھاں امرتسر والی دیپال پور چلی گئی "

" نینی چلتا کاروبار کرے گی "

" بلا مونچھاں والا اپنی بیٹیوں کو لے کر چلا گیا "

" توبہ ہے ۔ یہ دنیا تو اب اُجڑ کر رہے گی "

غفوراں بازار کی حالت سے سخت پریشان تھی اور دلال کہتا تھا :

" غفوراں ، فکر نہ کرو ۔ بازار اُجڑتا نہیں ۔ سمجھو بُرا نے مال کی چھانٹی ہو رہی ہے " پھر بھی خیال رکھنا چاہیئے ۔

غفوراں نے اپنی معلومات بہم پہنچائیں ۔

" سُنا ہے اخبار والے آکر تصویریں لیتے ہیں اور پوچھ گچھ کرتے ہیں "

غفوراں اخبار والوں کے خوف میں دن گزارتی اور پولیس والوں کے

خطرے میں رات ۔ اُس کے نوچیوں کو باہر کے حالات کا زیادہ علم نہ تھا کہ ایک دن گلی کے مکان پر چھاپہ پڑا ۔ غفوراں نے دوسرے ہی دن حفظِ ماتقدّم کے طور پر شہر کے ایک معزز علاقے میں مکان کی تلاش شروع کر دی اور اگلے چند دنوں میں وہاں سے چلی گئی ۔

نئی جگہ پہ کاروبار شروع کرنا ناممکن نہ سہی مشکل ضرور تھا ۔ مُنّی اور اس کی ساتھیوں کے لیے یہ تبدیلی انتہائی خوشگوار تھی ۔ ایک ہی ماحول اور ایک ہی دھرّے پر چل چل کر وہ اُکتا چکی تھیں ۔ نئے ماحول میں وہ خود نئی ہو گئیں ۔ مُنّی ان سب سے عُمر میں بڑی تھی ۔

"بھی ، کیسے کیسے مرد آتے تھے ۔ نوعُمر مزدور چھوکرے ۔ بھوکے اور نیدیدے ہوس کار بوڑھے ، بیویوں سے اکتائے ہوئے شوہر ۔

یہاں آکر مُنّی کی قیمت چند سکّے بڑھ گئی ۔ مُنّی حسین نہ تھی ۔ اگر جوان ہو سکتی تو ممکن تھا حسین ہوتی ۔ وقت کے ہاتھ نے اس کے بوٹے سے قد پر حادثات کی آکاس بیل پھینک دی تھی ۔ مُنّی کی اپنی ذات کہاں تھی ۔ ساری آکاس بیل زرد اُداس ۔

نئے علاقے میں ایک سال اور بیت گیا ۔ وہ ایک بار پھر پُرانی ہو گئی ۔

مُنّی نڈھال سی لیٹی تھی کہ ایک نیا آدمی داخل ہوا ۔ وہ خوش آمدید کہنے کی بجائے چمک کر بولی :

"یہ کیا ہے ؟"

مرد اپنے آپ اس کی پائنتی بیٹھ گیا ۔ بلب اس کی اوٹ میں تھا ۔ دھندلے

روشنی میں وہ اس کو پہچان نہ سکی اور پرے کھسکتے ہوئے بولی:

"کیا ہے؟ دفع ہو۔"

"آج کرفیو کھلا ہے نا۔"

مرد کی آواز پر سرگوشی کا گمان ہوتا تھا۔ منّی کے ذہن نے جھٹکا سا کھایا آنے والا نیا نہ تھا۔

"اوہ! اچھا اسی لیے۔ ہی ہی۔"

وہ اپنے بال درست کرتی ہوئی بولی۔

"ہوں تو پھر ——؟"

"پھر؟"

⁂

اس کے بعد چند روز تک کرفیو نہ لگا اور وہ لگاتار کئی راتیں آتا رہا۔ جب ایک گاہک کئی بار آتا تو منّی اس سے مانوس سی ہو جاتی۔ اس سے باہر کے حالات پوچھنے لگتی۔ مگر جیسے ہی وہ بات شروع کرتی غفوراں کی غصیلی آواز سنائی دیتی۔

اس لگاتار آنے والے گاہک نے اپنا نام عبداللہ بتایا تھا۔ عبداللہ نہ تو لونڈا سا تھا نہ بوڑھا۔ بس ایسی عمر تھی جس پر عورت بلا سوچے سمجھے بھروسا کرنا چاہتی ہے۔ عبداللہ منّی سے باتیں کرنا پسند کرتا تھا۔ وہ جو کچھ کہتی توجہ سے سنتا۔ کچھ پوچھتی تو تسلی بخش جواب دیتا۔ معمولی پڑھا لکھا ہونے کے باوجود زمانے کی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ وہ کیا کاروبار کرتا تھا۔ یہ راز عبداللہ نے ہمیشہ راز ہی رہنے دیا۔ اس کے میلے چیکٹ کپڑوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی کارخانے میں ملازم ہوگا۔ اکثر کپڑے جگہ

جگہ سے پھٹے ہوئے ہوتے۔ منّی ہنستے ہوئے پوچھتی :

" لڑ کر آئے ہو؟"

" ہاں "، عبداللہ گھونسا ہوا میں لہرا کر جواب دیتا۔

اس نے بائیں ہاتھ کے ناخن بڑھا رکھے تھے۔ منّی نے ایک روز پوچھ ہی لیا:

" یہ ناخن کیوں بڑھا رکھے ہیں؟"

" یہ ہتھیار ہے۔ اوزار ہے "، عبداللہ ہاتھ کو الٹ پلٹ کر نچاتا ہوا بولا۔

" توبہ! اللہ مارا ریچھ کا ہاتھ "، منّی سکڑ گئی۔

" دشمن کا منہ نوچ کر رکھ دوں۔ آنکھیں نکال دوں "، وہ جوش سے کہہ رہا تھا۔

"جانتی ہو، ہمارے دشمن کون ہیں؟"

منّی نے نفی میں سر ہلایا تو عبداللہ نے بتانا شروع کیا۔ اسی دوران باہر آہٹ ہوئی اور وہ اٹھ کر چلا گیا۔ غفوراں بڑبڑاتی اندر آئی :

"کیا رام کہانی لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ مجھے تو خفیہ کا آدمی لگتا ہے۔ شہر میں بڑی گڑبڑ ہے "

منّی نے غفوراں کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ وہ اس خیال سے تسکین حاصل کر رہی تھی کہ اب باہر سناٹا ہے۔

بتی گل کر کے وہ سونے کی کوشش میں تھی کہ سائرن ہوا۔ گلی میں پاؤں کی چاپ کئی گنا بڑھ گئی۔ کسی ایک نے دوسرے کو بتایا :

" بہتر گھنٹے کا کرفیو ہے، بہتر گھنٹے کا۔ دن میں راشن پانی کے لیے کھل جائے تو کھل جائے "

غفوراں نے صحن میں کھڑے کھڑے سینہ کوٹا۔

"خدا خدا کر کے چار دن کو کھلا تھا۔ ویسے ہی گر لی مار دو ظالمو۔"

آوازوں سے پتہ چلتا تھا کہ غفوراں کے ارد گرد کی باقی عورتیں جمع ہیں اور تبادلۂ خیالات کر رہی ہیں۔ مُنّی ان آوازوں سے پرے اکیس سال پہلے اپنے پرانے قصبے میں پھر رہی تھی، جہاں بسنے رہنے کو گھر تھے۔ ماں، باپ، بہن، رشتے دار، ہمسائے کھیت، پگڈنڈیاں، سکول راستہ اور راستے میں پڑنا کولہو، پھولاں ہنستی کھیلتی بوٹیاں کھاتی پھولاں، اونٹ، جلوس، ہنگامے، کرفیو، قافلہ اور پھر چیختی چلاتی پھولاں۔ اور وہ۔ مُنّی کی آنکھوں میں آنسو آتے چلے گئے۔ اسے عورتیں پکارتی رہیں اور وہ سوتی بنی روتی رہی۔

❖

بہت گھنٹے بیکار رہنے، جی بھر کر رونے اور اداس ہونے کے بعد اس نے خوب استری کر کے کپڑے پہنے۔ ٹالکم پوڈر کی موٹی تہہ سے چہرے کی جھریاں اور داغ چھپانے کی کوشش کی۔ عطر کی پوری شیشی بدن پر مل لی۔ یہ شیشی ایک روز عبداللہ لایا تھا۔ وہ تشکر آمیز نگاہوں سے اُسے دیکھتی تو بولا:

"روٹی سے پیسے کاٹ کر تمہارے لئے عطر لایا ہوں۔ میری جان۔"

اور جب اس نے لگاوٹ سے پوچھا:

"روٹی کپڑا پورا نہیں ہوتا اور ادھر کیوں آتے ہو؟"

تو وہ خجل سی ہنسی ہنسا:

"غریب آدمی کیا کرے؟ ایک بھوک کا بندوبست کرتا ہے، دوسری رہ جاتی ہے۔"

"تمھاری بہری"۔ منّی نے اس کے خشک ہونٹوں پر انگلی پھیرتے ہوئے پہلی بار پوچھا۔

"تھی۔ بھاگ گئی۔ تمھاری طرح کہیں بیٹھی ہو گی"۔

"اوہ!"

اس کے بعد ان کے درمیان گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ عبداللہ اس روز دروازے پر دستک ہونے سے بھی پہلے چلا گیا۔ منّی نے عطر کی شیشی بغیر سونگھے تکیے کی تہہ میں دبا دی۔

"بیچارہ"۔

منّی لفظ بھوک سے اس قدر بدکتی تھی کہ اسے سنتے ہی بڑے بڑے خیالات آنے لگتے تھے۔ روٹیاں، بوٹیاں، قافلہ، مسلسل بھوک، ہوس۔

غفوراں نے پچھلے بہتر گھنٹوں میں لفظ بھوک کو اتنا بے دریغ استعمال کیا تھا کہ منّی کے ذہن میں اس لفظ سے وابستہ یادیں بار بار گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ آج کی رات آنے والا پہلا شخص عبداللہ ہی تھا۔ وہ اس کے پہلو میں اس طرح آگرا جیسے زخمی کبوتر۔

"کیا ہوا؟" منّی نے سنبھلتے ہوئے پوچھا۔

"لوگ میرا پیچھا کر رہے ہیں"۔

"کیوں؟"

"نہیں کچھ بھی معلوم نہیں تو آگے مت پوچھو"۔

"واہ! مجھے کیوں معلوم نہیں"۔

مُنّی بچوں کی طرح ٹھنکی - پھر سنجیدہ ہو گئی - "پچھلے اکیس برس کی ایک ایک بات ایک ایک لمحہ مجھے یاد ہے"۔

"یاد ہے تو پوچھتی کیوں ہو؟"

عبداللہ کا لہجہ روکھا اور کیفیت اضطراری تھی۔ مُنّی نے میلی چھت کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"اس وقت تو لوگ آزادی مانگتے تھے۔ اب کیا چاہتے ہیں؟"

"اب - اب - مُنّی! یہ جو اپنا پاکستان ہے نا ــــ جان لے یہ وہی تمہارا کٹا ہوا ادنٹ ہے ــــ ہر آدمی اپنی اپنی چھری پکڑے اپنا اپنا تھیلا بھر رہا ہے ــــ اور مجھے یوں لگتا ہے۔ جیسے میں چوراہے میں پڑا ہوں اور لوگ میری بوٹیاں نوچ رہے ہیں ــــ وہ کوٹھاسی لاش میں ہوں"۔

"نہیں ــــ وہ تو میں ہوں"۔

مُنّی نے بمشکل اتنا کہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ان آنسوؤں میں پُرآشوب تاریخ کا بہاؤ تھا۔ کچھ شکوؤں کی چمک تھی۔ بے چارگی، بے بسی اور مایوسی کی گراوٹ تھی۔ آنسو بہتے رہے۔ عبداللہ کی آنکھیں سُننی رہیں۔ مُنّی نے اپنے دامن سے آنکھیں خشک کیں۔ اُس کی آواز رُندھی ہوئی تھی:

"کیا تم مجھے اس عذاب سے چھڑا سکتے ہو؟"

اب وہ عبداللہ کے چہرے کو ایسے تک رہی تھی جیسے وہ سچ مچ لاش ہو اور نگاہ کے اسی زاویے پر ملکُ الموت نے اس کی روح قبض کی ہو۔ مُنّی کا سوال بالکل سیدھا تھا، تاہم عبداللہ نے کچھ توقّف کے بعد جواب دیا:
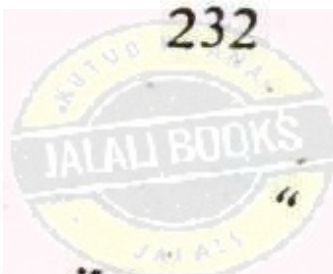
"ہاں مُنّی - اگر میں بچا تو "

"پھر ____؟" مُنّی کوئی وعدہ لینا چاہتی تھی۔ عبداللہ اس کے قریب سرک آیا:

"پھر ____ روٹیوں کا جھگڑا ہے - بوٹیوں کا قضیہ ہے - خیر دفع کرو۔"

معائینِ انسانوں کا چھینٹا سا اندر آ گرا - غفوراں غصیلی کراری آواز میں کہہ رہی تھی:

"کرفیو لگنے والا ہے - دفع ہو ____ کیا لمبی حکایتیں لے بیٹھا ہے۔"

عبداللہ سر نہوڑائے کمرے سے باہر نکل گیا - اس کے پیچھے دو مٹت اور اور کھسکے ____ چند لمحوں کی خاموشی ____ مُنّی کا ذہن ماضی میں بھٹکنے لگا۔ بوٹیاں، انسان، اونٹ، گدھ، کُتّے، قافلہ، پھولاں، رات اور دھڑ دھڑ کرتا دل ____ پھر دستک ____ مُنّی غم اور غصّہ ضبط کئے وقت کے ہاتھوں اپنی بوٹیاں تڑوانے لگی :-

مسیرزا ریاض
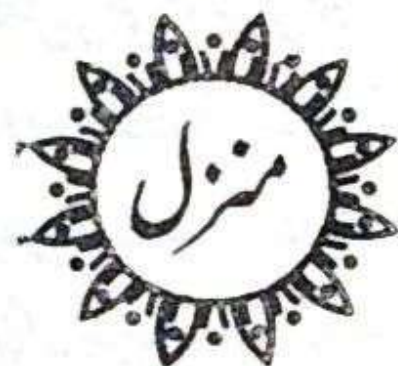
آسمان ابھی تک گہرے سرمئی، سیاہ بادلوں سے بھرا ہوا تھا، یخ بستہ اور تیز و تند ہوائیں چلنے لگی تھیں، فضا سہمی سہمی، ٹھٹھری ہوئی تھی، مگر آج تو گھر سے نکلنا از بس ضروری تھا، ہفتہ بھر سے کاروبار بند تھا۔ گھر کا ہر فرد جہاں قدرت سے شکوہ کر رہا تھا وہاں دست فقیر بنا بیٹھا تھا اور ہر چہرہ کشکول، تھوڑی بہت رقم جو گھر میں تھی ختم ہو چکی تھی۔ نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اُٹھ رہی تھیں اور اس پہ آ کے رُک جاتی تھیں، وہ جو اس گھر کی ان داتا تھی، اور صبح جو ایک دم بارش تھم گئی تو ان کے چہرے لہلہاتے کھیتوں کی طرح خوشی سے جھومنے لگے تھے، نفرت اور اکتاہٹ، محبت اور دلچسپی میں بدل گئی، وہ اس کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ اس کے ناز اُٹھانے لگے تھے، جیسے وہ بڑے ارمانوں سے حاصل کی گئی دُلہن ہو۔

اور اگرچہ اس کی طبیعت کسل مند تھی، مگر فرض شناسی کے ایک شعوری جذبے اور پختہ احساس کے ساتھ بڑی مستعدی سے وہ تین بجے ہی تیار ہو گئی تھی۔ اُس نے بڑی محنت سے سنگھار کیا تھا اور واقعی دُلہن لگنے لگی تھی، اور اس نے آئینے سے منہ موڑ لیا

اور دروازے پہ آنکھیں گاڑ دیں اور ارشاد کا انتظار کرنے لگی۔ آج گھر میں خاصہ ہنگامہ تھا، ہر فرد نے تیاری میں اس کا ہاتھ بٹایا تھا، اور اس میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا اور ساتھ ساتھ اپنی اپنی ضروریات کی فرمائش کی تھی جو سانچی پان سے لیکر فلم، جوتے، سکول کی فیس اور شراب تک تھیں، خود دو روز سے اُس نے مارفیا کے انجکشن نہیں لگوائے تھے، اور کل سے تو سگریٹ بھی میسر نہ آئے تھے، اور نشے سے محرومی کی وجہ سے وہ نہ صرف مضمحل تھی بلکہ ایک ہولناک اذیت سے ہمکنار رہی جیسے گرم گرم سوئیاں اس کے بدن میں چبھوئی جا رہی ہوں؟ اس کا رؤاں رؤاں کچے گوشت کی طرح پھڑکنے لگا تھا۔

بہر حال وہ سب کے مطالبات سُن سُن کر مسکراتی رہی تھی، سرہلاتی رہی تھی آج اُمیدوں کا دن تھا۔

ارشاد ابھی تک نہیں آیا تھا، ہر لمحہ اضطراب بڑھنے لگا تھا۔ گھر کے تمام افراد اسے وداع کرنے کے لیے جمع تھے، ان کے کان تانگے کی آہٹ پہ تھے۔ نگاہیں ادھ کھلے دروازے پر اور ذہن پُھراج کے حسن وجمال کی طرف: پھر چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور خوشی سے دل اُچھلنے لگے اور باجی نے پیش گوئی کر دی کہ آج تو پھو سے کوئی بھی نہ بچ سکے گا، منہ مانگی قیمت وصول کرے گی، اور باجی کا اس دھندے میں چالیس برس کا تجربہ تھا، اس کی بات سُن کر دلاور خاں کے منہ سے رال ٹپکنے لگی، اب تو وہ ولائتی پیئے گا، اس نے سوچا، باجی نے اس کی للچائی ہوئی نظروں کو بدشگونی خیال کیا اور پُھراج پر سے مرچوں کی نذر اتاری۔ سُلگتی ہوئی مرچوں کی بُو گھر میں پھیل گئی۔ گھر کے لوگوں کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا، اور وہ کھانسنے لگے، کھانستے کھانستے ہنسنے لگے، اور پھر معاً سب

بے چین ہو گئے، شادا ابھی تک نہ آیا تھا، کم بخت شادا! اور سردیوں کے دن تھے۔
ابھی پل بھر میں شام ہونے والی تھی۔ اسے اب گھر سے نکل پڑنا تھا۔ یہ شادا تو نہایت
غیر ذمہ دار چھوکرا ہے۔ کئی بار پہلے بھی اسی طرح کر چکا ہے۔ چرسی کہیں کا، پڑا ہو گا
کہیں۔ کئی بار بکھراج نے سوچا اس سے الگ ہو جائے اور غلام رسول یا سراج دین
سے بات کرلے۔ اس محلے میں بھلا تانگے والوں کی کیا کمی ہے۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکی تھی۔
وہ ناگزیر تھا اس کے لیے۔ وہ اس کی محتاج تھی۔ اس کاروبار میں شادے جیسا "گنی"
شہر بھر میں نہ ہو گا۔ نہ صرف گر گیان کا واقف بلکہ اس دھندے کے اسرار و رموز کا ماہر،
گاہک کو ڈھونڈ نکالنا اور پھر اسے اپنے دام میں پھانس لینا اس کے بائیں ہاتھ کا ایک
ادنیٰ سا کھیل تھا۔ لوگوں کے ہجوم میں اس کی تیز نگاہیں ہوس ناک چہروں اور بھوکی روحوں
کو یوں ڈھونڈ لیتیں، وہ پل بھر کے لیے ناک کو سکیڑتا جیسے کچھ سونگھ رہا ہو اور پھر وہ مارا، کہہ
کے اپنے شکار پہ جھپٹ پڑتا اور اسے کبھی دھوکا نہ ہوتا اور اس کا نشانہ کبھی خطا نہ جاتا،
ہونٹوں پہ ایک بیباک سی ہنسی، آنکھوں میں غنڈوں کی سی بے حجابی۔ بکھرے ہوئے گھنگھریالے
بال، پیشانی پہ کھدا ہوا نیلا چاند تارا، ایک دانت سونے کا، چابک ہلانے کا ایک وحشیانہ
اور بے خطر سا انداز۔ و ربظاہر اپنی گھوڑی سے خاص ذومعنی انداز سے پنجابی فلموں کے
فحش ڈائیلاگ، جن سے وہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف کر لیتا اور پھر آنکھوں کے خاص اشاروں
سے "اسامی" کو بیٹھ جانے کی دعوت دیتا، وہ شیخی بگھارتا "کھوماٹی ذرا پہچاننے کی کوشش
کیا کر، تو تو بس احمق ہی رہے گی، میں مر گیا تو بھوکی مرے گی" وہ چہروں پہ لکھے جلی حروف
اسے سمجھایا کرتا، ہوس ناک چہرے، بھوکے چہرے، للچائے، ترسے ہوئے چہرے، آوارہ
اور مرنجاں چہرے، طلب گار چہرے، اور ان چہروں سے وہ ان کی جیبوں کا اندازہ لگا لیا کرتا

تھا، وہ ایسے تماشبین حضرات سے سخت نالاں تھا جو زندگی میں محض ادھر ادھر ٹھرک جھاڑ کر گزارہ کر لیتے ہیں اور عیاشی کی مد میں ایک ٹیڈی پیسہ خرچ کرنا گناہِ عظیم خیال کرتے ہیں۔

وہ اس کی شیخیوں سے تنگ تھی، وہ اس کی عادتوں سے بھی تنگ تھی، وہ اپنی مرضی کا مالک تھا۔ حساب کتاب کرتا تو اپنے جائز حصہ سے زیادہ لیتا، ویسے بھی جب پیسے کی ضرورت ہوتی وقت بے وقت آن دھمکتا، شور مچاتا، گرفتاری کی دھمکی دیتا، اور اسے طرح طرح سے پریشان کرتا، مگر وہ ناگزیر تھا، اور وہ اس سے الگ کچھ بھی نہ تھی۔

اسی سوچ میں گم تھی کہ تانگے کی آواز نے اسے چونکا دیا، گھر میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہ باہر نکل آئی مگر وہ شادے کا تانگہ نہ تھا، ڈھیلے کل پرزوں والا ایک بوسیدہ سا تانگہ گلی میں ہچکولے کھاتا ہوا آ رہا تھا۔ دُور دُور تک گلی سنسان تھی۔ وہ واپس اندر جانا چاہتی تھی کہ تانگہ اس کے سامنے رُک گیا، ایک پل کے لیے وہ جھجکی مگر پھر اُچھل کر تانگے میں جا بیٹھی، شادا ہی سب کچھ نہیں، مقدر کا لکھا بھی تو بہت کچھ ہوتا ہے۔ اُس نے دل میں سوچا اور تانگے والے کو چلنے کا اشارہ کیا۔

"کس طرف چلوں بی بی؟" مڑ کے دیکھے بغیر تانگے والے نے بے جان آواز میں پوچھا۔

"بڑی سڑک کی طرف"۔ پکھراج نے بڑی تمکنت سے جواب دیا۔

"اور سواری بٹھالوں بی بی؟"

"نہیں، سالم ہو گا۔"

"چل اوئے راجے" تانگے والے نے خوش ہوکر کہا اور گھوڑا مورنی کی چال چلنے لگا۔ راجے کو کوئی جلدی نہ تھی، راجے کے مالک کو کوئی جلدی نہ تھی، راجہ بڑی احتیاط سے قدم اُٹھا رہا تھا کہ کہیں اس کے مالک کا زاویہ نہ بگڑ جائے جو بڑے اطمینان سے ٹانگیں سیٹ پر پسارے کمبل میں لپٹا لپٹا یا کسی مہاتما کی طرح بیٹھا تھا اور یوں کائنات کا نظام درہم برہم نہ ہو جائے، پکھراج کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ جیسے تانگہ، گھوڑا اور کوچوان سب کے سب حرکت سے محروم ہو گئے ہیں، اس نے غور سے جائزہ لیا تو اسے سب کچھ ایک اُجڑا ہوا ماضی معلوم ہونے لگا، عمر رسیدہ کوچوان، ٹوٹا پھوٹا تانگہ، مریل سا گھوڑا پھر اسے شادے کے تانگے کا خیال آیا، سفید، توانا اور برق رفتار گھوڑا۔ سجا سجایا تانگہ اور بانکا چھیلا شادا، سب کچھ نیا، جوان اور یہ سب کچھ فرسودہ، بے ہنگم، الف لیلہ کے کرداروں کی طرح عجیب اور مضحکہ خیز!

منزل تک پہنچتے پہنچتے شاید برسوں لگ گئے۔ اُس نے سوچا تانگہ بدل لے، پھر جیسے کسی نے اس کے دل میں سرگوشی کی، یہ بوڑھا اس کے سفر، اس کے پیشے، اس کے مقصد سے ناواقف ہے۔ وہ کیوں اس پردے کو چاک کرنا چاہتی ہے۔

"اب کس طرف موڑوں تانگہ؟" تانگے والے نے پوچھا۔

پکھراج گھبرا گئی، اس کے سامنے کئی راستے تھے، کئی موڑ، کئی سمتیں، مشرق، مغرب، شمال، جنوب۔ سب آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ شادے کے بغیر تمام سڑکیں اجنبی سی معلوم ہونے لگی تھیں، اُس نے پہچاننے کی کوشش کی، اسے کس طرف جانا ہے، یوں بھی اسے راستوں اور سڑکوں کے نام کم ہی یاد رہتے تھے، ہاں مگر چند ایک سڑکوں کے جہاں وہ برسوں بھٹک رہی تھی، وہ کہاں سے شروع ہو کر کہاں جا کر ختم ہوتیں، اس کا اسے علم نہ تھا۔ وہ تو ان راہوں کی دھول بنی رہی تھی، جب سے اُس نے ہوش

سنبھالا تھا، یوں ہی رواں دواں تھی، کولھو کے بیل کی طرح، ایک چکر میں اسیر، منزل سے نا آشنا، نشانِ منزل سے بے خبر، کسی انجانے سفر پہ رواں، صبح و شام ازل سے ابد تک ایک نہ ختم ہونے والا عجیب، سپاٹ، بے رنگ و بو اور پُر خطر سفر، جہاں سایہ ہے نہ چھاؤں، پھول ہیں نہ پتے، ندیاں ہیں نہ پہاڑ، نشیب ہیں نہ فراز، جہاں آواز کا زیر و بم نہیں، جہاں لہروں کا مد و جزر نہیں، جہاں پگڈنڈیاں نہیں، سمتیں نہیں، کرنیں نہیں، دھوپ نہیں، چاندنی نہیں، جہاں ہوائیں نہیں چلتیں، صرف ایک خلا ہے، ایک بے ہنگم، بے تکا خلا، جس میں وہ معلق ہے، شکنجے میں جکڑی ہوئی۔

تانگے والے نے گلا صاف کر کے ایک بار پھر استفسار کیا تو وہ اس خلا سے باہر نکلی، مگر وہ اسے کیا بتائے کہاں جانا ہے اور اسے اپنے راہنما شادے کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ محسوس ہونے لگی۔ پھر اُس نے تانگے والے سے کہا وہاں لے چل جہاں رونق ہو، ہنگامہ ہو، چہل پہل ہو، شورش بادہو، روشنیاں، رنگا رنگ روشنیاں اور ہجومِ عاشقاں ہو۔ یہ جواب سُن کر پہلی بار بابے نے مڑ کر سواری کی طرف دیکھا اور اس کا منہ کُھلے کا کُھلا رہ گیا، استعجاب، خوف اور تجسّس کے جذبات ایک ساتھ اُبھرے اور آپس میں گڈ مڈ ہو گئے۔ طوائف کے تصوّر نے ہمیشہ اس کے جذبات کو گرمایا تھا، مگر اتنے قریب سے اسے دیکھنے کا موقع اس سے پیشتر نہ ملا تھا، سُنا بہت کچھ تھا، اور جب اس کے ہم پیشہ لوگ چٹخارے لے لے کر ایسی عورتوں کی باتیں کرتے، تو ان کے چہرے کسی انتہائی پُراسرار خوشی سے دمکنے لگتے تھے، ان کی باتیں اس کے شوق کو اکساتیں۔ اس کا بوڑھا دل ڈوبنے لگتا، طوفان میں گرفتار کشتی کی طرح ہچکولے کھاتا اور اس رات جب وہ تانگہ کھول کر اپنی نیم تاریک کوٹھڑی میں جاتا اور اپنے ٹھنڈے بستر کی لحد میں

اترتا تو تخیل کے جگنو چمکنے لگتے، مگر حوصلے کی کمی کے باعث وہ حسرتوں کے انبار لگاتا رہا تھا، اور آج اچانک چاند لہرانے لگا تھا۔ مگر ایک دوسرے ہی خیال نے اس پہ غلبہ پالیا، بچپن میں سُنی ہوئی مولوی صاحب کی باتیں اس کے دل و دماغ میں پیوست تھیں، یہ عورتیں جو گناہوں کی گٹھڑیاں اور چلتی پھرتی غلاظتیں ہیں، جو جہنم کا ایندھن ہیں، ایکبارگی اس کا جی چاہا اسے اُٹھا کر زمین پر پٹخ دے اور تانگہ تیز بھگا کر لے جائے اور گھر پہنچ کر تانگے کو کئی بار دھوئے، پاک صاف کرے، مگر پھر جیسے خوشبو کی ایک لہر اُبھری اور اس کے جسم و جان کے گوشے گوشے کو معطر کر گئی اور تجسس کی طلسمی وادیوں میں کھو گیا، یہ مخلوق کیا ہوتی ہے؟ کیسے بولتی ہے؟ کیسے ہنستی ہے؟ کس چیز کی بنی ہوتی ہے اور دُور سینے کے بند غاروں سے کچھ دم توڑتی تمنائیں بیدار ہونے لگیں، آنکھیں ملتی ہوئی زندہ ہونے لگیں، مچلنے لگیں، بے طرح، بے سبب، بے مقصد!

وہ اب تن کے بیٹھ گیا، اُس نے کمبل بھی ایک طرف رکھ دیا، اسے اپنے اندر توانائی اور حرارت کا احساس ہونے لگا، خوف کی جگہ حوصلے اور حیرت کی جگہ یگانگت نے لے لی۔

اور قریب سے گذرتے ہوئے ایک کوچوان نے بابے کے تانگے پر نظر ڈالتے ہوئے نعرہ لگایا "او خیر ہووی بابا رکھیا" اور بابے رکھے نے ایک جوان قہقہہ لگایا، اور ایک بھرپور نگاہ سے بکھراج کا جائزہ لیا، چہرے پر پوڈر، ہونٹوں پر سُرخ لپ اسٹک، آنکھوں میں کاجل کی لکیر، چنبیلی کی خوشبو میں بسی ہوئی، وہ ایک ایکٹرس لگ رہی تھی، فلم کا اشتہار معلوم ہو رہی تھی۔ اُس نے برقعے کے بٹن کھول رکھے تھے اور اس انداز سے بیٹھی تھی کہ اس کا جسم دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ وہ اس کے گرم سانس کے اتار چڑھاؤ کو محسوس کر رہا تھا، سانس کے ساتھ اس کے سینے کا زیر و بم بھی نمایاں تھا۔ اس کی

چوڑیوں کی کھنک میں اسے زندگی بخش نغموں کی تانیں سنائی دے رہی تھیں، اس کا جی چاہا اس سے باتیں کرے، ڈھیروں باتیں، جو اس نے کبھی کسی عورت سے نہ کی تھیں، مگر پکھراج نے اسے بالکل نظر انداز کر دیا تھا، اس بڈھے کا اسے یوں ہٹ ہٹ دیکھنا بالکل گوارا نہ تھا، اسے یوں لگ رہا تھا جیسے بڈھے کے جھریوں والے کھردرے ہاتھ اس کے نرم و ملائم جسم کو چھو رہے ہوں، اس کا جی چاہا بابے کے منہ پر تھپڑ مارے، ایک، دو تین اور جو چند ایک دانت اس کے منہ میں ہیں انہیں بھی توڑ ڈالے، مگر اس وقت وہ کچھ نہ کر سکتی تھی، وہ مجبور تھی اور محتاج، بابے کے ہاتھ میں اس وقت اس کی حیات کی کنجی تھی، لہٰذا وہ ہر ذلت برداشت کر سکتی تھی۔ اس انتہائی مصروف اور قیمتی لمحے میں وہ اسے چھوڑ نہ سکتی تھی۔ سامنے لوگوں کا ہجوم تھا، چہل پہل، رونق، شورش، ہاؤ ہو اور روشنیاں، اور دُور اندھیرے گھر میں بھُو کے ننگے معذور اور بیمار، اپنی اپنی تمنّاؤں کو سینوں سے لگائے اپنے مسیحا کی راہ تک رہے تھے۔

اس وقت پکھراج کے جسم کا ایک حصّہ بڑے خلوص سے اپنے اہم ترین فرض کی تکمیل میں مصروف تھا، ہر بُنِ مو منزل کی جستجو میں منہمک اور سرگرم عمل، بڑے اہتمام سے اُس نے اپنے بدن کے خطوط کو ایسے زاویوں میں ڈھالا تھا کہ جن میں نگاہیں اٹک کے رہ جائیں، جسم کے نشیب و فراز کو یوں ترتیب دیا کہ نگاہیں اُلجھ کے رہ جائیں، ایک خمار کی کیفیت اس کی آنکھوں میں تھی، اور چاروں طرف آوارہ، گمراہ اور پیاسی نگاہیں اس کے وجود کے پیچ و خم کو قصاب کی انگلیوں کی طرح ٹٹول رہی تھیں، اس کے اندر لہو تیزی سے گردش کرنے لگا، اسے اپنا جسم ایک بھڑکتا ہوا شعلہ معلوم ہو رہا تھا، ہوس ناک نگاہیں تیز شراب کی طرح اس کی رگوں میں اُترتی جا رہی تھیں۔

سردی کا احساس مٹ گیا تھا، ہر جگہ حرارت تھی، آگ ہی آگ شعلوں کا جہنم، جذبات کا لاوا اُبل رہا تھا، اور تانگے کے چاروں طرف رکشا، ٹیکسیاں، سکوٹر اور تانگے ایک وحشیانہ رقص میں مصروف تھے، جیسے پھول پہ بھونروں کی طرح منڈلا رہے تھے، اَن گنت ہاتھوں کے اشارے، اَن گنت آنکھوں کی طلب، اَن گنت دلوں کی دھڑکنیں پکھراج کے تعاقب میں تھیں اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے منزل اب قریب ہے، چند قدموں کے فاصلے پر اور اس نے دیکھا چاروں طرف چمکتی، جگمگاتی رنگین روشنیاں اس کے ساتھ مسکرا رہی ہوں۔

بابا رکھا اس کے اضطراب کو دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یہ تجربہ اس کے لیے بالکل نیا تھا، نیا اور عجیب، وہ ایک سیدھا سادا انسان تھا، اور اس کی زندگی رنگ و بو سے خالی، سپاٹ! اس نے ہوش سنبھالا تو وہ اصطبل میں گھوڑے کے "خرخرا" کر رہا تھا، بڑا ہو کر اُس نے اپنا تانگہ گھوڑا بنوا لیا، اور یوں اس کی زندگی مکمل ہو گئی اور پھر اسی گردشِ لیل و نہار میں عمر عزیز کے ساٹھ برس گزر گئے۔ ساٹھ طویل سال، صبح و شام کے چکر میں اسیر، وقت کا زندانی، نہ جانتے ہوئے کہ آفتاب کب طلوع ہوتا ہے، اور بہار کب آتی ہے؟

"ٹھہرو" اور بابے نے یکدم لگامیں کھینچ لیں اور مڑ کر دیکھا۔

"واپس چلو" پکھراج نے دوسرا حکم صادر کیا۔

"واپس کہاں؟" بابے نے کچھ احتجاجاً پوچھا۔

"جہاں سے آئے ہیں!"

"جہاں سے آئے ہیں" دل میں بڑبڑاتے ہوئے اُس نے گھوڑے کا رُخ موڑ دیا

راجہ تھک چکا تھا، بابا بھی تھک چکا تھا، اور سردی دمبدم بڑھتی جا رہی تھی، مگر پکھراج کو دیکھ کر وہ اپنی تھکن بھول گیا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو حیران رہ گیا، وہ جگہ جہاں ابھی ابھی میلہ لگ رہا تھا قبرستان دکھائی دے رہی تھی، یہ لوگ کہاں چلے گئے تھے؛ وہ بھوکی نگاہیں، للچائے ہوئے چہرے، بے ہنگم اشارے، گندے آوازے، ایک دم کہاں گم ہو گئے؟ یوں ڈر کر بھاگ گئے جیسے پکھو، کوئی چڑیل ہو، بابے کو دُکھ ہوا، مگر وہ کیا کر سکتا تھا، سڑکیں، فٹ پاتھ، ریستوران، سب جیسے موت کی نیند سو گئے ہوں، وہ جانتا تھا، شاید پکھراج بھی جانتی تھی کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا، سفینہ ڈوب رہا تھا، اور وہ اپنے ناتواں ہاتھوں سے اسے تھام رہی تھی، سڑک پر اکا دکا متحرک سائے کو اس نے بڑی تیزی سے اپنی گرفت میں لینا چاہا، مگر ہر سایہ بڑی تیزی سے اس کی گرفت سے پھسل پھسل گیا، اس کا جی چاہا چوک میں کھڑے ہو کر اعلان کر دے کہ تماش بینو! اس وقت لنڈے کا مال ہے۔ بہت سستے داموں مل سکتا ہے، کھڑے سوچ کیا رہے ہو؟ یہ موقع پھر کبھی نہ آئے گا۔

بابے نے دیکھا وہ بجھی ہوئی راکھ کی مانند سفید ہو چکی تھی، ابھی ابھی یہاں اُمیدوں اور اُمنگوں کا ایک متلاطم سمندر تھا اور اب حسرتوں کی ایک ٹھہری ہوئی جھیل، ابھی ابھی یہ عورت ایک شعلہ تھی اور اب محض راکھ!

"اللہ وارث ہے" بابے نے تسلی دی، مگر وہ تو کچھ اور ہی سوچ رہی تھی، اور سوکھے پتے کی طرح کانپ رہی تھی، کسی مانوس خوف سے لرز رہی تھی، جب وہ خالی ہاتھ گھر میں داخل ہو گی تو سب کے سب غضب ناک ہو جائیں گے۔ وہ اسے فحش گالیاں دیں گے۔ اس کا گلا دبوچ لیں گے، اگر ایسا نہ کیا تو پھر مار مار کر اس کے جسم

کو نیلا کر دیں گے! راکھشش! اپنی اپنی طلب کے دیوانے، جو محض اسے ایک ٹکسال سمجھتے ہیں، اپنی غلیظ خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ!

اک آخری نگاہ ان جانے پہچانے راستوں پہ ڈالتے ہوئے اس نے بابے سے واپس گھر چلنے کو کہا، اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے سینماؤں پہ آویزاں ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویروں والے قدآدم بورڈ، فلموں کے اشتہارات اس کا منہ چڑا رہے ہیں، اس کی پستی کا مذاق اُڑا رہے ہیں، بڑی بڑی عمارتوں پہ جگمگاتی رنگارنگ روشنیاں اسے شرارت آمیز آنکھیں مار رہی ہیں، ہوٹلوں اور ریستورانوں میں بجتے ہوئے گانوں کی شوخ آوازیں اس کی بے بسی و بے چارگی پر بین کر رہی ہیں، اور پھر جیسے دیکھتے ہی دیکھتے ہر آواز اور ہر تصویر نے قالب اختیار کر لیا، اور وہ ہنسنے لگے، اور یہ ہنسی رفتہ رفتہ شور قیامت کا رنگ اختیار کر گئی، اور اس کے کان پھٹنے لگے۔ اس نے انگلیاں

دونوں کانوں میں ٹھونس لیں۔ اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا اور بے سدھ ہو کر گر پڑی۔ اسے صرف تانگے کے چلنے کا احساس تھا۔ اور جب اسے ہوش آیا تو اُس نے دیکھا وہ بابے کے پھٹے پرانے کمبل میں لپٹی ہوئی ہے اور جیسے کائنات اندھیرے کے کفن میں بند ہے اور زندگی کی ہر حرارت، روشنی، ٹھنڈک اور تاریکی میں بدل گئی ہے اور موت کے سرد ہاتھ ہر طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں، اُس نے محسوس کیا اگر یہ کمبل نہ ہوتا تو اب تک وہ برف کی سل بن گئی ہوتی، اور پھر جیسے اسے اپنے نتھنوں کے قریب گرمی کا احساس ہوا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا، بابا چائے کی گرم پیالی ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔

"اسے پی لو، سردی بہت ہے اور پھر بوندیں بھی پڑنے لگی ہیں۔"

ایکبارگی غصّے کی ایک لہر اس کے سارے جسم میں بجلی کی کرنٹ کی طرح گزر گئی، اس کا جی چاہا چائے کی یہ گرم گرم پیالی بابے کے منہ پر دے مارے، جس منحوس کی وجہ سے آج اس کی یہ حالت ہوئی تھی، اس وقت وہ بھی اس کا مذاق اُڑا رہا تھا، ایک چائے کی پیالی دے کر "پی لو! ٹھنڈی ہو رہی ہے" بابے کی التجا میں حکم بھی تھا اور شفقت بھی۔

اس نے پیالی بابے کے ہاتھ سے لے لی، اور جلدی جلدی پینے لگی، وہ صبح سے بھوکی تھی، پھر اس نے بابے سے اسپرو کی دو گولیاں منگوائیں اور ساتھ چائے کی دوسری پیالی بھی۔ چائے ختم کرنے کے بعد اس نے دیکھا، بابا دکان پہ بیٹھا چائے کے خم پہ خم لنڈھائے جا رہا تھا، پہلی بار اُس نے بابے کو بغور دیکھا، پریشان بال، سفید داڑھی، ناتواں جسم، چہرے پر اَن گنت جھریاں، بُجھی بُجھی سی آنکھیں، وہ اسے یوں لگا جیسے بجھتے دیے کی لو ہو، وہ اس کی طرف دیکھتی رہی، وہ مزے لے لے کر چائے پی رہا تھا۔ اور اس کا جی چاہا وہ اسے یوں ہی دیکھتی چلی جائے، وہ اسے ایک فرشتہ سا لگ رہا تھا جس کے پر کاٹ دیے گئے ہوں اور جو اب آسمان کی طرف پرواز کرنے سے محروم ہو گیا ہو، پھر نہ جانے کیوں وہ بابے کی بیوی اور بچّوں کے بارے میں سوچنے لگی۔

"پوری پانچ پیالیاں پی ہیں۔ بابے نے تلنگے میں بیٹھتے ہوئے بڑے فخر سے کہا، ہم تو بس اسی پہ زندہ ہیں، اپنا تو یہ پٹرول ہے"۔ یہ کہہ کر بابا ہنسنے لگا، پھر راج کو بھی ہنسی آگئی۔

راجے کو تھپکی دیتے ہوئے اُس نے کہا "بس یہی ایک یار ہے ہمارا، گھر پہنچ

لے راجے پھر تیری خدمت کروں گا صبح سے بھوکا ہے۔" گھوڑا مالک کے قول کی صداقت میں ہنہنانے لگا، پھر بابے نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "پورے ہفتہ بعد تانگہ جُتا تھا، اب پھر شاید جھڑی لگ جائے۔ ہے بھی آج جمعرات"

پکھوکانپ اُٹھی، "کیا وقت ہوگا؟" اس نے بابے سے پوچھا

"یہی کوئی نو بج رہے ہوں گے"

"اُف" ایک سرد آہ پکھراج کے لبوں پر سہم کے رہ گئی۔ پانچ بجے وہ گھر سے نکلی ہوگی، اس نے سوچا، چار گھنٹے کشمکش، تذبذب، اضطراب، اُمید و بیم، اذیت، مایوسی، شکست اور ذلت کے چار گھنٹے، چار سال، چار صدیاں!

پکھراج نے بابے رکھے سے سگریٹ مانگا اور لمبے لمبے کش کھینچنے لگی، دھوئیں کے اُڑتے ہوئے سرمئی بادلوں میں اسے اپنی زندگی کی تصویریں بنتی بگڑتی ہوئی نظر آئیں، مگر دھوئیں کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے؟ وہ بابے کے عامیانہ سے سوال کا جواب دینے کے لیے ابتدا کا سراغ لگا رہی تھی، وہ سوال جو آج تک ہر روز اس سے ہر گاہک نے پوچھا تھا، رسمی طور پر، ہمدردی جتانے کے لیے یا پھر بات کا آغاز کرنے کے لیے، اور جس کا جواب اُس نے ہر بار ایک بالکل نئی مختلف اور درد بھری کہانی سنا کر دیا تھا اگرچہ سننے والے جھوٹ سمجھتے مگر ہمدردی جتانے کیلئے اسے کچھ رقم بخشش کے طور پر مقررہ سودے سے زیادہ دے جایا کرتے تھے، یہ کہانیاں اس کی باجی نے اسے سکھائی تھیں، اور وہ موقعہ و محل کے مطابق سُنا دیا کرتی تھی، اور کیا وہ بابے کو بھی وہی کہانی سُنائے گی۔ جھوٹ اور مکرو فریب کی کہانی، اور سچ بولنے کی تو نہ اب اسے عادت ہے اور نہ ہی جرأت! آخر بابے نے اس سے یہ سوال کیوں پوچھ لیا ہے؟ کیوں اسے اتنی کڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے؟ وہ ہر گز بابے کو اپنی زندگی کے ماضی و حال کا رازداں نہ بنائے گی۔

وہ ہرگز بابے کے خلوص کی کاری ضرب سے اپنی میلی روح کو زخمی نہ ہونے دے گی، وہ محض ایک تانگے والا ہے۔ اسے سوائے اپنے کرائے کے مجھ پر کسی قسم کا حق نہیں۔ ابھی چند لمحوں بعد وہ دونوں پھر کبھی نہ ملنے کے لیے جدا ہو جائیں گے، اور پھر اگر وہ اپنی کہانی بابے کی دلجوئی کے لیے اور تجسس کی خاطر سنا بھی دے، تو وہ بھی تو اوروں کی طرح اسے محض من گھڑت افسانہ سمجھ کے یقین نہ کرے گا، کوئی بھی تو یقین نہیں کرتا، اس کی کسی بات کا، اس کی مسکراہٹ جھوٹ بن چکی ہے، وہ جو خود ایک جھوٹ ہے، وہ جھوٹ جو دمبدم دھواں بن کے تحلیل ہوتا جا رہا ہے، اور پھر جیسے ایک نامعلوم سا جذبہ اس کے اندر جاگ اُٹھا، اور یہ جذبہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا، اور اس کا جی چاہا اپنی کہانی سنا دے۔ کہانی جو اُن کہانیوں سے مختلف تھی جو اس کی اُستاد باجی نے اسے سکھائی تھیں، کہانی جو جگر کی گہرائیوں سے اُبھری تھی۔ کہانی جو ازل سے اب تک پھیلی ہوئی تھی، کہانی جس کے صرف کردار بدلتے ہیں، کبھی پکھراج ہے تو کبھی زمرد، کبھی شمشاد ہے تو کبھی کوثر اور وہ کیسے یقین دلائے کہ پکھراج کے اندر بانو ہے اور زمرد کے اندر عالیہ۔ کون جانے شمشاد بچپن میں معصومہ تھی اور کوثر کلثوم! اور پھر حالات بدل گئے تو رنگ رُوپ بھی بدل گئے۔ جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب وہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر گھروں سے نکلی ہوں گی کہ پھر واپس گھروں کو نہ گئیں۔ اور اس گھڑی سے بانو، عالیہ اور معصومہ کی ماؤں کی آنکھیں رو رو کر اندھی ہو گئی ہیں اور دروازوں کے پٹ ابھی تک ان کے انتظار میں کھلے پڑے ہیں، اور اب اگر یہ بھٹکی ہوئی لاشیں کبھی اپنے گھروں تک پہنچ بھی جائیں تو کون پہچانے گا ان مسخ چہروں کو۔ کون یقین کرے گا، اس لیے کہ نہ وہ اب نام رہے ہے نہ صورتیں، نہ حالات رہے اور نہ دل، وقت کی ایک کروٹ نے سب کچھ بدل دیا ہے، سوائے ایک چیز کے، ماؤں کے نہ رُکنے والے آنسو کہ

وہ چراغ ہیں جو زمرد، کوثر اور پکھراج کی گم کردہ روحوں کو روشنی بخشتے ہیں۔

ایک نیم روشن سی گلی میں سے گزرتے ہوئے بابے نے غور سے مکانوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" جب تمہارا گھر آئے تو مجھے روک لینا۔ اندھیرے میں مجھے کم ہی نظر آتا ہے۔"

" اور تمہارا گھر کہاں ہے؟" پکھراج نے پوچھا۔

بابا خوش ہو گیا، یہ پہلا سوال پکھراج نے اس سے کیا تھا۔

" کم سے کم ڈیڑھ میل ہو گا یہاں سے، جہاں آبادی ختم ہو جاتی ہے۔"

" اوہ، پھر تو اس اندھیری رات میں تمہارے بیوی بچے ڈر رہے ہوں گے۔"

بابے نے ایک خوف ناک قہقہہ لگایا جس کی صدائے بازگشت دیر تک وہ سنتی رہی،

" کلا دم، نہ دھوکہ تے نہ غم" بابے نے جواب دیا، نہ وہ مغموم تھا نہ اُداس۔

" ہاں مگر" تھوڑی دیر بعد وہ کہنے لگا" آس پاس کے گھروں کے سب بچے اپنے ہی بچے ہیں، بس یہ ضرور جی چاہتا ہے کہ دن بھر کے بعد جب میں اپنی کال کوٹھڑی میں قدم رکھوں تو چولہے میں آگ جل رہی ہو جس پر چائے کی کیتلی رکھی ہو اور کیتلی میں سے گرم گرم دھواں اُٹھ رہا ہو۔" پھر ہنستے ہوئے کہنے لگا" ویسے آس پاس کے گھروں کے لوگ میرا بڑا خیال رکھتے ہیں۔"

اور یوں ہی پکھراج نے سوچا جیسے ہر چیز ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے، ماضی، حال اور مستقبل، تمنائیں، سنہرے خواب، حسین تصورات، دلکش رعنائیاں، سب کچھ، ہر خوشبو، سانس کی حرارت، لہو کی گردش، ہر چیز چکنا چور ہو کے وقت کے ساگر میں بہہ گئی ہے اور

وقت کے اتھاہ ساگر کی ایک ہلکی سی لہر اسے بہت دُور پیچھے کی طرف لے اُڑی ہزوں سال کے بندھن توڑ کے، اور جیسے وہ اپنے روشن اور خوبصورت ڈرائینگ روم کے صوفے پہ اپنے ابّو کی آغوش میں بیٹھی ہوئی چاروں طرف بکھرے پڑے قیمتی کھلونوں سے بے نیاز الف آم، ب بلّی پڑھتے پڑھتے وہیں سو گئی ہو بابل کی یاد سے اس کے دل و دماغ میں

ہلچل سی مچ گئی۔ وہ بابل جس کی شکل کا تصوّر بھی اس کے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔

"لو تمہارا گھر آگیا" بابے نے ایک مکان کے سامنے تانگہ روک دیا۔

وہ سناٹے میں آگئی، سگریٹ اس نے اپنی انگلیوں میں مسل دیا، اور تانگے سے یوں اُتری جیسے کسی لاش کو لحد میں اُتارا گیا ہو۔ گلی دُور دُور تک سنسان تھی، اکثر گھروں کے چراغ گل تھے، بارش ہونے لگی تھی، بوجھل قدم اُٹھاتے ہوئے وہ گھر کے دروازے تک پہنچی اور بغیر دستک دیے واپس لوٹ آئی۔

"تمہارا کرایہ .... کرا .... یہ ...... میں ..... صبح"۔ اندھیرے میں اس نے دیکھا شاید بابا مسکرا رہا تھا۔ ایک تھکی تھکی سی، غمزدہ سی، اُداس سی مسکراہٹ!

"جاؤ آرام کرو، بڑی ٹھنڈ ہے اور تم تھکی ہوئی ہو" بابے نے کہا۔

تانگے سے گھر کی دہلیز تک کا چند قدموں کا فاصلہ شاید اُس نے گھنٹوں میں طے کیا، اور ابھی اُس نے دستک دینے کے لیے ہاتھ اُٹھایا تھا کہ ایک آواز نے اُسے چونکا دیا،

آواز جو شہد میں گھلی ہوئی تھی، فرشتے کی آواز جو اس کے وجود کی آہنی دیواروں کو توڑ کر اس کی روح کے بند دریچوں کو کھٹکھٹانے لگی تھی، وہ سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھی۔

"دھی اے (بیٹی)" بابے نے دوبارہ آواز دی اور کھراج کو یوں محسوس ہوا جیسے

اس کے جسم کے مساموں کے راستے برسوں کی متعفن غلاظتیں سیلاب کی صورت بہہ نکلی ہوں۔

وہ تیزی سے بابے کے پاس پہنچی، بابے نے اپنے بدبودار کپڑوں کی مختلف تہوں کے کونوں کھدروں سے اپنی کُل رقم نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دی،

"نہیں! نہیں......" ایک ہلکی سی چیخ اس کے لبوں پر لرزنے لگی۔

بابے نے اپنے سخت کھردرے اور جھریوں والے ہاتھ اس کے سر پہ رکھ دیے، اور گھوڑے کو چابک لگائی۔ گھوڑا موری کی چال چلنے لگا، پکھراج دیر تک گلی میں کھڑی اسے دُور تک دیکھتی رہی۔

پھر وہ اپنے دروازے تک گئی، دستک دی تو کواڑ کُھل گئے۔ گھر کے تمام افراد جاگ اُٹھے اور پُر اشتیاق، متوقع اور اُمید بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگے، دونوں ہاتھوں میں موجود رقم اس نے نیچے زمین پر پھینک دی، اک چھناکے کے ساتھ ہی گھر کے تمام افراد چیلوں کی طرح میلے پھیلے نوٹوں اور نقدی پر جھپٹ پڑے۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔

پکھراج چپکے سے باہر نکل آئی، بہت دُور تانگے کی زرد روشنیاں ابھی تک کانپ رہی تھیں، پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ روشنیاں نور کا سیلاب بن کر ساری کائنات پر چھا گئیں اور اندھیرے چھٹ گئے۔ راہیں منور ہو گئیں۔ پکھراج نے اپنے بازو پھیلا دیے اور تانگے کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگی۔

آنندی

غلام عباس

بلدیہ کا اجلاس زوروں پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیرِ بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

بلدیہ کے ایک بھاری بھر کم رکن جو ملک و قوم کے سچے خیر خواہ اور دردمند سمجھے جاتے تھے، نہایت فصاحت و بلاغت سے تقریر کر رہے تھے۔

"...... اور پھر حضرات! آپ یہ بھی خیال فرمائیے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گزرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے۔ چنانچہ ہر شریف آدمی کو چار و ناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفا کی پاک دامن بہو بیٹیاں اس بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبان! جب یہ شریف زادیاں ان آبرو باختہ، نیم عریاں بیسواؤں کے بناؤ سنگھار کو دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دلربائی کی نئی نئی امنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنے غریب شوہروں سے طرح طرح کے غازوں، لونڈروں، زرق برق ساریوں اور قیمتی زیوروں کی فرمائشیں کرنے لگتی ہیں

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا پُرمسرت گھر، ان کا راحت کدہ ہمیشہ کے لیے جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔

"۔۔۔۔ اور صاحبان! پھر آپ یہ بھی تو خیال فرمایئے کہ نہالانِ قوم، جو درسگاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور جن کی آئندہ ترقیوں سے قوم کی امیدیں وابستہ ہیں اور قیاس چاہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا سہرا ان ہی کے سر بندھے گا، انہیں بھی صبح و شام اسی بازار سے ہو کر آنا جانا پڑتا ہے۔ یہ قحبائیں جو ہر وقت بارہ ابھرن سولہ سنگھار کیے ہر راہرو پر بے حجابانہ نگاہ و مژہ کے تیر و سناں برساتی اور اسے دعوتِ حسن پرستی دیتی ہیں۔ کیا انہیں دیکھ کر ہمارے بھولے بھالے ناتجربکار، جوانی کے نشے میں سرشار، سود و زیاں سے بے پروا نونہالانِ قوم اپنے جذبات و خیالات اور اپنی اعلیٰ سیرت کو معصیت کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ صاحبان! کیا ان کا حسنِ زاہد فریب ہمارے نونہالانِ قوم کو جادۂ مستقیم سے بھٹکا کر، ان کے دل میں گناہ کی پُراسرار لذتوں کی تشنگی پیدا کر کے ایک بے کلی، ایک اضطراب، ایک ہیجان برپا کر دیتا ہو گا۔۔۔۔"

اس موقع پر ایک رکنِ بلدیہ جو کسی زمانہ میں مدرس رہ چکے تھے، اور اعداد و شمار سے خاص شغف رکھتے تھے، بول اٹھے:

"صاحبان! واضح رہے کہ امتحانوں میں ناکام رہنے والے طلبہ کا تناسب پچھلے پانچ سال کی نسبت ڈیوڑھا ہو گیا ہے۔"

ایک رکن نے، جو چشمہ لگائے تھے اور ایک ہفتہ وار اخبار کے مدیرِ اعزازی تھے، تقریر کرتے ہوئے کہا: "حضرات! ہمارے شہر سے روز بروز غیرت، شرافت، مردانگی، نکوکاری و پرہیزگاری اٹھتی جا رہی ہے اور اس کے بجائے بے غیرتی، نامردی، بزدلی، بدمعاشی، چوری اور جعل سازی کا دَور دورہ ہوتا جا رہا ہے۔ منشیات کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ قتل و غارت، خودکشی اور دیوالہ نکلنے کی وارداتیں بڑھتی

جا رہی ہیں۔ اس کا سبب محض ان زنانِ بازاری کا ناپاک وجود ہے۔ کیونکہ ہمارے بھولے بھالے شہری ان کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر ہوش و خرد کھو بیٹھتے ہیں۔ اور ان کی بارگاہ تک رسائی کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریق سے زر حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس سعی و کوشش میں جامۂ انسانیت سے باہر ہو جاتے اور نہایت قبیح افعال کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ جانِ عزیز ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور یا جیل خانوں میں پڑے سڑتے ہیں۔"

ایک پنشن یافتہ معمر رکن، جو ایک وسیع خاندان کے سرپرست تھے اور دنیا کا سرد و گرم دیکھ چکے تھے اور اب کش مکشِ حیات سے تھک کر باقی ماندہ عمر ستانے اور اپنے اہل و عیال کو اپنے سایے میں پنپتا ہوا دیکھنے کے متمنی تھے، تقریر کرنے اٹھے۔ ان کی آواز لرزتی ہوئی تھی اور لہجہ فریاد کا انداز لیے ہوئے تھا۔ بولے: "صاحبان! رات رات بھر ان لوگوں کے طبلے کی تھاپ، ان کی گلے بازیاں، ان کے عشاق کی دھینگا مشتی، گالی گلوچ، شور و غل، ہاہا ہو ہو ہو سن سن کر آس پاس کے رہنے والے شرفاء کے کان پک گئے ہیں۔ ضیق میں جان آ گئی ہے۔ رات کی نیند حرام ہے تو دن کا چین مفقود۔ علاوہ ازیں ان کے قرب سے ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق پر جو برا اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ ہر صاحبِ اولاد خود کر سکتا ہے۔۔۔۔"

آخری فقرہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔ سب اراکینِ بلدیہ کو ان سے ہمدردی تھی کیونکہ بدقسمتی سے ان کا قدیمی مکان اس بازارِ حسن کے عین وسط میں واقع تھا۔

ان کے بعد ایک رکن بلدیہ نے، جو پرانی تہذیب کے علمبردار تھے! و زآثارِ قدیمہ کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، تقریر کرتے ہوئے کہا:

"حضرات! باہر سے جو سیاح اور ہمارے احباب اس مشہور اور تاریخی شہر کو

دیکھنے آتے ہیں جب وہ اس بازار سے گزرتے ہیں اور اس کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو یقین کیجیے کہ ہم پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔"

اب صدر بلدیہ تقریر کرنے اٹھے۔ گو قد ٹھنگنا اور ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے تھے مگر سر بڑا تھا جس کی وجہ سے بردبار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ لہجہ میں حد درجہ متانت تھی۔ بولے "حضرات! میں اس امر میں قطعی طور پر آپ سے متفق ہوں کہ اس طبقہ کا وجود ہمارے شہر اور ہمارے تہذیب و تمدن کے لیے باعثِ صد عار ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔ اگر ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ یہ اپنا ذلیل پیشہ چھوڑ دیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟"

ایک صاحب بول اٹھے "یہ عورتیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔"

اس پر ایک طویل فرمائشی قہقہہ پڑا اور ہال کی ماتمی فضا میں یکبارگی شگفتگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اجلاس میں خاموشی ہوئی تو صاحب صدر بولے "حضرات! یہ تجویز بارہا ان لوگوں کے سامنے پیش کی جا چکی ہے۔ اس کا ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ آسودہ اور عزت دار لوگ خاندانی حرمت و ناموس کے خیال سے انہیں اپنے گھروں میں نہ گھسنے دیں گے۔ اور مفلس اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو جو محض ان کی دولت کے لیے ان سے شادی کرنے پر آمادہ ہوں گے یہ عورتیں خود منہ نہیں لگائیں گی۔"

اس پر ایک صاحب بولے "بلدیہ کو ان کے نجی معاملوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں بلدیہ کے سامنے تو یہ مسئلہ ہے کہ یہ لوگ چاہے جہنم میں جائیں مگر اس شہر کو خالی کر دیں۔"

صدر نے کہا "صاحبان! یہ بھی آسان کام نہیں۔ ان کی تعداد دس بیس نہیں سینکڑوں تک پہنچتی ہے اور پھر ان میں سے بہت سی عورتوں کے ذاتی مکانات ہیں۔"

یہ مسئلہ کوئی مہینہ بھر تک بلدیہ کے زیرِ بحث رہا اور بالآخر تمام اراکین کی اتفاق رائے سے یہ امر قرار پایا کہ زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کو خرید لینا چاہیے اور انہیں رہنے کے لیے شہر سے کافی دور کوئی الگ تھلگ علاقہ دے دینا چاہیے۔ ان عورتوں نے بلدیہ کے اس فیصلے کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بعض نے نافرمانی کر کے بھاری جرمانے اور قیدیں تک بھگتیں مگر بلدیہ کی مرضی کے آگے ان کی کوئی پیش نہ چل سکی اور وہ ناچار صبر کر کے رہ گئیں۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک ان زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کی فہرستیں اور نقشے تیار ہوتے اور مکانوں کے گاہک پیدا کیے جاتے رہے۔ بیشتر مکانوں کو بذریعہ نیلام فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان عورتوں کو چھ مہینے تک شہر میں اپنے پرانے ہی مکانوں میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تاکہ اس عرصے میں وہ نئے علاقہ میں مکان وغیرہ بنوا سکیں۔

ان عورتوں کے لیے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے چھ کوس دور تھا۔ پانچ کوس تک پکی سڑک جاتی تھی اور اس کے آگے کوس بھر کا کچا راستہ تھا۔ کسی زمانہ میں وہاں کوئی بستی ہوگی مگر اب تو کھنڈروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا جن میں سانپوں اور چمگادڑوں کے مسکن تھے اور دن دہاڑے اُلّو بولتا تھا۔ اس علاقے کے نواح میں کچے گھروندوں والے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ مگر کسی کا فاصلہ بھی یہاں سے دو ڈھائی میل سے کم نہ تھا۔ ان گاؤں کے بسنے والے کسان دن کے وقت کھیتی باڑی کرتے یا یونہی پھرتے پھراتے ادھر نکل آتے تو نکل آتے ورنہ عام طور پر اس شہرِ خموشاں میں آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بعض اوقات روزِ روشن ہی میں گیدڑ اس علاقے میں پھرتے دیکھے گئے تھے۔

سارا دن آس پاس کے گاؤں کے دیہاتی اپنے کھیتوں میں اور دیہاتنیں اپنے گھروں میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ دور سے آتی ہوئی کھٹ کھٹ کی دھیمی آوازیں سنتی رہتیں۔

اس بستی کے کھنڈروں میں ایک منہدم مسجد کے آثار تھے اور اس کے پاس ہی ایک کنواں تھا جو بند پڑا تھا۔ راج مزدوروں نے کچھ تو پانی حاصل کرنے اور میٹھ کرستانے کی غرض سے اور کچھ ثواب کمانے اور اپنے نمازی بھائیوں کی عبادت گزاری کے خیال سے سب سے پہلے اس کی مرمت کی۔ چونکہ یہ فائدہ بخش اور ثواب کا کام تھا۔ اس لیے کسی نے کچھ اعتراض نہ کیا۔ چنانچہ دو تین روز میں مسجد تیار ہو گئی۔

دن کو بارہ بجے جیسے ہی کھانا کھانے کی چھٹی ہوتی دو ڈھائی سو راج، مزدور، میر عمارت، منشی اور ان بیسواؤں کے رشتہ دار یا کارندے جو تعمیر کی نگرانی پہ مامور تھے اس مسجد کے آس پاس جمع ہو جاتے اور اچھا خاصا میلہ سا لگ جاتا۔

ایک دن ایک دیہاتی بڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی اس بستی کی خبر سن کر آگئی۔ اس کے ساتھ ایک خورد سال لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب ایک درخت کے نیچے گھٹیا سگریٹ بیڑی، چنے اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگا دیا۔ بڑھیا کو آئے ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک مٹکا اٹھا لایا۔ اور کنویں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا چبوترا بنا پیسے کے دو دو شکر کے شربت کے گلاس بیچنے لگا۔ ایک کنجڑے کو جو خبر ہوئی۔ وہ ایک ٹوکرے میں خربوزے بھر کر لے آیا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس بیٹھ کر لے لو خربوزے! شہد سے میٹھے خربوزے، کی صدا لگانے لگا۔ ایک شخص نے کیا کیا۔ گھر سے سری پائے پکا، دیگچی میں رکھ، خوانچہ میں لگا، تھوڑی سی روٹیاں، مٹی کے دو تین پیالے اور ٹین کا ایک گلاس لے آموجود ہوا اور اس بستی کے کارکنوں کو جنگل میں گھر کی ہنڈیا کا مزہ چکھانے لگا۔

ظہر اور عصر کے وقت میر عمارت، معمار اور دوسرے لوگ مزدوروں سے کنوئیں سے پانی نکلوا نکلوا کر وضو کرتے نظر آتے۔ ایک شخص مسجد میں جا کر اذان دیتا۔ پھر ایک کو امام بنایا جاتا اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ کسی گاؤں کے ایک ملّا کے کان میں جو یہ بھنک پڑی کہ فلاں مسجد میں امام کی ضرورت ہے وہ دوسرے ہی دن علی الصباح ایک سبز جزدان میں قرآن شریف، پنجسورہ، رحل اور مسئلے مسائل کے چند چھوٹے چھوٹے رسالے رکھ آموجود ہوا اور اس مسجد کی امامت باقاعدہ طور پر اسے سونپ دی گئی۔

ہر روز تیسرے پہر گاؤں کا ایک کبابی سر پر اپنے سامان کا ٹوکرا اٹھائے آجاتا۔ اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس زمین پر چولہا بنا کباب، کلیجی، دل اور گردے سیخوں پر چڑھا سستی والوں کے ہاتھ بیچتا۔ ایک بھٹیاری نے جو یہ حال دیکھا تو اپنے میاں کو ساتھ لے مسجد کے سامنے میدان میں دھوپ سے بچنے کے لیے پھونس کا ایک چھپّر ڈال تنور گرم کرنے لگی۔ کبھی کبھی ایک نوجوان دیہاتی نائی پھٹی پرانی کسبت گلے میں ڈالے جوتی کی ٹھوکروں سے راستے کے روڑوں کو لڑھکاتا اِدھر اُدھر گشت کرتا دیکھنے میں آجاتا۔

ان بیسواؤں کے مکانوں کی تعمیر کی نگرانی ان کے رشتہ دار یا کارندے تو کرتے ہی تھے کسی کسی دن وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے عشاق کے ہمراہ خود بھی اپنے اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آجاتیں اور غروبِ آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں۔ اس موقع پر فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آجاتیں اور جب تک خیرات نہ لے لیتیں اپنی صداؤں سے برابر شور مچاتی رہتیں اور انہیں بات نہ کرنے دیتیں۔ کبھی کبھی شہر کے لفنگے اوباش، بے کار مباش کچھ کیا کر

مصداق، شہر سے پیدل چل کر میسواؤں کی اس نئی بستی کی سن گن لینے آجاتے! ور اگر اس دن میسوائیں بھی آئی ہوتیں تو ان کی عید ہوجاتی ۔ وہ ان سے ذرا ہٹ کر ان کے گرداگرد چکر لگاتے رہتے ۔ فقرے کستے ، بے تکے قہقہے لگاتے ، عجیب عجیب شکلیں بناتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے ۔ اس روز کبابی کی خوب بکری ہوتی ۔

اس علاقے میں جہاں تھوڑے ہی دن پہلے ہُو کا عالم تھا اب ہر طرف گہما گہمی اور چہل پہل نظر آنے لگی ۔ شروع شروع میں اس علاقے کی ویرانی سے ان میسواؤں کو یہاں آکر رہنے کے خیال سے جو وحشت ہوتی تھی وہ بڑی حد تک جاتی رہی تھی اور اب وہ ہر مرتبہ خوش خوش اپنے مکانوں کی آرائش اور اپنے مرغوب رنگوں کے متعلق معماروں کو تاکیدیں کر جاتی تھیں ۔

بستی میں ایک جگہ ایک ٹوٹا پھوٹا مزار تھا جو قرائن سے کسی بزرگ کا معلوم ہوتا تھا ۔ جب یہ مکان نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے تو ایک دن صبح کو بستی کے راج ، مزدوروں نے کیا دیکھا کہ مزار کے پاس سے دھواں اٹھ رہا ہے اور ایک سرخ سرخ آنکھوں والا لمبا تڑنگا مست فقیر لنگوٹ باندھے چار ابرو کا صفایا کرائے اس مزار کے ارد گرد پھر رہا اور کنکر پتھر اٹھا اٹھا کر پرے پھینک رہا ہے ۔ دوپہر کو وہ فقیر ایک گھڑا لے کر کنوئیں پر آیا اور پانی بھر بھر کر مزار پر لے جانے اور اسے دھونے لگا ۔ ایک دفعہ جو آیا تو کنوئیں پر دو تین راج مزدور کھڑے تھے ۔ وہ نیم دیوانگی اور نیم فرزانگی کے عالم میں ان سے کہنے لگا: "جانتے ہو وہ کس کا مزار ہے ؟ کڑک شاہ پیر بادشاہ کا ! میرے باپ دادا ان کے مجاور تھے " اس کے بعد اس نے ہنس ہنس کر اور آنکھوں میں آنسو بھر بھر کر کڑک شاہ کی کچھ جلالی کرامتیں بھی ان راج مزدوروں سے بیان کیں ۔

شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دو دیئے اور سرسوں کا تیل لے آیا ۔

اور پیر کڑک شاہ کی قبر کے سرہانے اور پائینتی چراغ روشن کر دیئے ۔ رات کو پچھلے پہر کبھی کبھی اس مزار سے اللہ ہُو، کا مست نعرہ سنائی دے جاتا۔

چھ مہینے گزرنے نہ پائے تھے کہ یہ چودہ مکان بن کر تیار ہو گئے ۔ یہ سب کے سب دو منزلہ اور قریب قریب ایک ہی وضع کے تھے ۔ سات ایک طرف اور سات دوسری طرف ۔ بیچ میں چوڑی چکلی سڑک تھی ۔ ہر ایک مکان کے نیچے چار چار دکانیں تھیں ۔ مکان کی بالائی منزل میں سڑک کے رخ وسیع برآمدہ تھا ۔ اس کے آگے بیٹھنے کے لیے کشتی نما شہ نشین بنائی گئی تھی جس کے دونوں سروں پر یا تو سنگ مرمر کے مور رقص کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے اور یا جل پریوں کے مجسمے تراشے گئے تھے جن کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور آدھا انسان کا تھا ۔ برآمدے کے پیچھے چوڑا کمرہ بیٹھنے کے لیے تھا اس میں سنگِ مرمر کے نازک نازک ستون بنائے گئے تھے ۔ دیواروں پر خوش نما پچی کاری کی گئی تھی ۔ فرش سبز چمکدار پتھر کا بنایا گیا تھا ۔ جب سنگ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرشِ زمردیں پر پڑتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا سفید براق پروں والے راج ہنسوں نے اپنی لمبی لمبی گردنیں جھیل میں ڈبو دی ہیں ۔

بدھ کا شبھ دن اس بستی میں آنے کے لیے مقرر کیا گیا ۔ اس روز اس بستی کی سب بیسواؤں نے مل کر بہت بھاری نیاز دلوائی ۔ بستی کے کھلے میدان میں زمین صاف کرا کر شامیانے نصب کر دیئے گئے ۔ دیگیں کھڑکنے کی آواز اور گوشت اور گھی کی خوشبو بیس بیس کوس سے فقیروں اور کتوں کو کھینچ لائی ۔ دوپہر ہوتے ہوتے پیر کڑک شاہ کے مزار کے پاس ، جہاں لنگر تقسیم کیا جاتا تھا ، اس قدر فقیر جمع ہو گئے کہ عید کے روز کسی بڑے شہر کی جامع مسجد کے پاس بھی نہ ہوئے ہوں گے ۔

پیر کڑک شاہ کے مزار کو خوب صاف کروایا اور دھلوایا گیا اور اس پر پھولوں کی

چادر چڑھائی گئی، اور اس مست فقیر کو نیا جوڑا سلوا کر پہنایا گیا جسے اس نے پہنتے ہی پھاڑ ڈالا۔

شام کو شامیانے کے نیچے دودھ سی اُجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا۔ گاؤ تکیے لگا دیے گئے۔ پاندان، پیک دان، پیچوان اور گلاب پاس رکھ دیے گئے اور راگ رنگ کی محفل سجائی گئی۔ دُور دُور سے بہت سی بیسواؤں کو بلوایا گیا جو ان کی سہیلیاں یا برادری کی تھیں ان کے ساتھ ان کے بہت سے ملنے والے بھی آئے جن کے لیے ایک الگ شامیانے میں کرسیوں کا انتظام کیا گیا اور ان کے سامنے کے رُخ چقیں ڈال دی گئیں۔ بیشمار گیسوں کی روشنی سے یہ جگہ بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ ان بیسواؤں کے تو ندل سیاہ فام سازندے زربفت اور کمخواب کی شیروانیاں پہنے، عطر میں بسے ہوئے پھوئے کانوں میں رکھے، اِدھر اُدھر مونچھوں کو تاؤ دیتے پھرتے، اور زرق برق لباسوں اور تتلی کے پر سے بھی باریک ساریوں میں ملبوس، غازوں اور خوشبوؤں میں لسی ہوئی نازنینیں اٹھکیلیوں سے چلتیں۔ رات بھر رقص و سرود کا ہنگامہ برپا رہا اور جنگل میں منگل ہو گیا۔

دو تین دن کے بعد جب اس جشن کی تھکاوٹ اتر گئی تو یہ بیسوائیں سازو سامان کی فراہمی اور مکانوں کی آرائش میں مصروف ہوئیں۔ جھاڑ، فانوس، ظروف بلوری، قدِ آدم آئینے، نواڑی پلنگ، تصویریں اور قطعات سنہری چوکھٹوں میں جڑے ہوئے لائے گئے اور قرینے سے کمروں میں لگائے گئے۔ اور کوئی آٹھ روز میں جا کر یہ مکان کیل کانٹے سے لیس ہوئے۔ یہ عورتیں دن کا بیشتر حصہ تو استادوں سے رقص و سرود کی تعلیم لینے، غزلیں یاد کرنے، دھنیں بٹھانے، سبق پڑھنے، تختی لکھنے، سینے پرونے، کاڑھنے، گراموفون سننے، استادوں سے تاش اور کیرم کھیلنے، ضلع جگت، نوک جھونک سے جی بہلانے یا سونے میں گزارتیں اور تیسرے پہر غسل خانوں میں نہانے جاتیں جہاں ان کے ملازموں نے دستی پمپوں سے پانی نکال نکال کر ٹب بھر رکھے ہوتے۔ اس کے
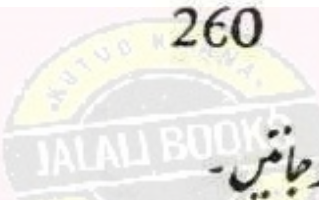
بعد وہ بناؤ سنگار میں مصروف ہو جاتیں۔

جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلتا یہ مکان گیسوں کی روشنی میں جگمگا اٹھتے جو جا بجا سنگِ مرمر کے آدھے کھلے ہوئے کنولوں میں نہایت صفائی سے چھپائے گئے تھے۔ اور ان مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں کے شیشے جو پھول پتیوں کی وضع کے کاٹ کر جڑے گئے تھے، ان کی قوسِ قزح کے رنگوں کی سی روشنیاں دُور جھلمل جھلمل کرتی ہوئی نہایت بھلی معلوم ہوتیں۔ یہ بیسوائیں بناؤ سنگار کئے برآمدوں میں ٹہلتیں، آس پاس والیوں سے باتیں کرتیں، ہنستیں کھلکھلاتیں۔ جب کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو اندر کمرے میں چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ ان کے سازندے ساز ملاتے رہتے اور یہ چھالیا کترتی رہتیں۔ جب رات بھیگ جاتی تو ان کے ملنے والے لڑکوں میں شراب کی بوتلیں اور پھل پھلاری لیے اپنے دوستوں کے ساتھ موٹروں یا تانگوں میں بیٹھ کر آتے۔ اس بستی میں ان کے قدم رکھتے ہی ایک خاص گہما گہمی اور چہل پہل ہونے لگتی۔ نغمہ و سرود، ساز کے سُر، رقص کرتی ہوئی نازنینوں کے گھنگروں کی آواز، قلقلِ مینا میں مل کر، ایک عجیب سرور کی سی کیفیت پیدا کر دیتی۔ عیش و مستی کے ان ہنگاموں میں معلوم بھی نہ ہوتا اور رات بیت جاتی۔

ان بیسواؤں کو اس بستی میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ دکانوں کے کرایہ دار پیدا ہو گئے جن کا کرایہ اس بستی کو آباد کرنے کے خیال سے بہت ہی کم رکھا گیا تھا۔ سب سے پہلے جو دکاندار آیا وہ وہی بڑھیا تھی جس نے سب سے پہلے مسجد کے سامنے درخت کے نیچے خوانچہ لگایا تھا۔ دکان کو پُر کرنے کے لیے بڑھیا اور اس کا لڑکا سگریٹوں کے بہت سے خالی ڈبے اٹھا لائے اور اسے منبر کے طاقوں میں سجا کر رکھ دیا گیا۔ بوتلوں میں رنگ دار پانی بھر دیا گیا تاکہ معلوم ہو شربت کی بوتلیں ہیں۔

بڑھیا نے اپنی لساط کے مطابق کاغذی پھولوں اور سگریٹ کی خالی ڈبیوں سے بنائی ہوئی بیلوں سے دکان کی کچھ آرائش بھی کی۔ بعض ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویریں بھی پرانے فلمی رسالوں سے نکال کر لیں سے دیواروں پر چپکا دیں۔ دکان کا اصل مال دو تین قسم کے سگریٹ کے تین تین چار چار پیکیٹوں، بیڑی کے آٹھ دس بنڈلوں، دیا سلائی کی نصف درجن ڈبیوں، پانوں کی ایک ڈھولی، پینے کے تمباکو کی تین چار ٹکیوں اور موم بتی کے نصف بنڈل سے زیادہ نہ تھا۔

دوسری دکان میں ایک بنیا، تیسری میں حلوائی اور شیر فروش، چوتھی میں قصائی، پانچویں میں کبابی اور چھٹی میں ایک کنجڑا آ بسے۔ کنجڑا آس پاس کے دیہات سے سستے داموں چار پانچ قسم کی سبزیاں لے آتا اور یہاں خاصے منافع پر بیچ دیتا۔ ایک آدھ ٹوکرا پھلوں کا بھی رکھ لیتا۔ چونکہ دکان خاصی کھلی تھی، ایک پھول والا اس کا ساجھی بن گیا۔ وہ دن بھر پھولوں کے ہار، گجرے اور طرح طرح کے گہنے بناتا رہتا اور شام کو انہیں چنگیر میں ڈال ایک ایک مکان پر لے جاتا اور نہ صرف پھول ہی بیچ آتا بلکہ ہر جگہ، ایک ایک دو دو گھڑی بیٹھ کے، سازندوں سے گپ شپ بھی ہانک لیتا اور حقے کے دم بھی لگا آتا۔ جس دن تماش بینوں کی کوئی ٹولی اس کی موجودگی ہی میں کوٹھے پر چڑھ آتی اور گانا بجانا شروع ہو جاتا تو وہ سازندوں کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود گھنٹوں اٹھنے کا نام نہ لیتا، مزے سے گانے پر سر دھنتا اور بیوقوفوں کی طرح ایک ایک کی صورت تکتا رہتا۔ جس دن رات زیادہ گزر جاتی اور کوئی ہار بچ رہتا تو اسے اپنے گلے میں ڈال لیتا اور بستی کے باہر گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتا پھرتا۔

ایک دکان میں ایک بیسوا کا باپ اور بھائی جو درزیوں کا کام جانتے تھے سینے کی ایک مشین رکھ کر بیٹھ گئے۔ ہوتے ہوتے ایک حجام بھی آ گیا اور اپنے ساتھ ایک

رنگریز کو بھی لیتا آیا۔ اس کی دکان کے باہر الگنی پر لٹکے ہوئے طرح طرح کے رنگوں کے لہریا دوپٹے ہوا میں لہراتے ہوئے آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہونے لگے۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک ٹٹ پونجیے بساطی نے جس کی دکان شہر میں چلتی نہ تھی، بلکہ اسے دکان کا کرایہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا تھا شہر کو خیر باد کہہ کر اس بستی کا رُخ کیا۔ یہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کے طرح طرح کے لونڈر، قسم قسم کے پاوڈر، صابن، کنگھیاں، بٹن، سوئی، دھاگا، لیس، فیتے، خوشبودار تیل، رومال، منجن وغیرہ کی خوب بکری ہونے لگی۔

اس بستی کے رہنے والوں کی سرپرستی اور ان کے مربیانہ سلوک کی وجہ سے اسی طرح دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی ٹٹ پونجیا دکاندار، کوئی بزاز، کوئی پنساری، کوئی نیچہ بند، کوئی نانبائی مندے کی وجہ سے یا شہر کے بڑھتے ہوئے کرائے سے گھبرا کر اس بستی میں آپناہ لیتا۔

ایک بڑے میاں عطار جو حکمت میں بھی کسی قدر دخل رکھتے تھے ان کا جی شہر کی گنجان آبادی اور حکیموں اور دوا خانوں کی افراط سے جو گھبرایا تو وہ اپنے شاگردوں کو ساتھ لے شہر سے اٹھ آئے اور اس بستی میں ایک دکان کرایہ پر لے لی۔ سارا دن بڑے میاں اور ان کے شاگرد دواؤں کے ڈبوں، شربت کی بوتلوں اور مربے، چٹنی اچار کے بویاموں کو الماریوں اور طاقوں میں اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھتے رہے۔ ایک طاق میں طب اکبر، قرابادین قادری اور دوسری طبی کتابیں جما کر رکھ دیں۔ کواڑوں کی اندرونی جانب اور دیواروں میں جو جگہ خالی بچی وہاں انہوں نے اپنے خاص الخاص مجربات کے اشتہار سیاہ روشنائی سے جلی لکھ کر اور دفتیوں پر چپکا کر آویزاں کر دیئے۔ ہر روز صبح کو بیسواؤں کے ملازم گلاس لے لے کر آموجود ہوتے اور شربت بزوری، شربت بنفشہ، شربت انار اور ایسے ہی اور نزہت بخش، روح افزا شربت و عرق، خمیرہ گاؤزبان

اور تقویت پہنچانے والے مربے مع ورق ہائے نقرہ لے جاتے۔

جو دکانیں بچ رہیں ان میں میسواؤں کے بھائی بندوں اور سازندوں نے اپنی چارپائیاں ڈال دیں۔ دن بھر یہ لوگ ان دکانوں میں تاش، چوسر اور شطرنج کھیلتے، بدن پر تیل ملواتے، سبزی گھوٹتے، بٹیروں کی پالیاں کراتے، تیتروں سے سبحان تیری قدرت کی رٹ لگواتے اور گھڑا بجا بجا کر گاتے۔

ایک میسوا کے سازندے نے ایک دکان خالی کرا اپنے بھائی کو جو ساز بنانا جانتا تھا، اس میں لا بٹھایا۔ دکان کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کیلیں ٹھونک کر ٹوٹی پھوٹی مرمت طلب سارنگیاں، ستار، طنبورے، دلربا وغیرہ ٹانگ دیئے گئے۔ یہ شخص ستار بجانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شام کو وہ اپنی دکان میں ستار بجاتا جس کی میٹھی آواز سن کر آس پاس کے دکاندار اپنی دکانوں سے اٹھ اٹھ کر آ جاتے اور دیر تک بت بنے ستار سنتے رہتے۔ اس ستار نواز کا ایک شاگرد تھا جو ریلوے کے دفتر میں کلرک تھا۔ اسے ستار سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جیسے ہی دفتر سے چھٹی ہوتی سیدھا سائیکل اڑاتا ہوا اس بستی کا رخ کرتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دکان ہی میں بیٹھ کر مشق کیا کرتا۔ غرض اس ستار نواز کے دم سے بستی میں خاصی رونق رہنے لگی۔

مسجد کے ملا جی، جب تک تو یہ بستی زیرِ تعمیر رہی، رات کو دیہات میں اپنے گھر چلے جاتے رہے۔ مگر اب جب کہ انہیں دونوں وقت مرغن کھانا بافراط پہنچنے لگا تو وہ رات کو بھی یہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ بعض میسواؤں کے گھروں سے بچے بھی مسجد میں آنے لگے جس سے ملا جی کو روپے پیسے کی آمدنی بھی ہونے لگی۔

ایک شہر شہر گھومنے والی گھٹیا درجہ کی تھیٹریکل کمپنی کو جب زمین کے چڑھے دئے کراتے اور اپنی بے مائگی کے باعث شہر میں کہیں جگہ نہ ملی تو اس نے اس بستی

کا رُخ کیا اور ان بیسواؤں کے مکانوں سے کچھ فاصلہ پر میدان میں تنبو کھڑے کر کے ڈیرے ڈال دیئے۔ اس کے ایکٹر اداکاری کے فن سے محض نابلد تھے۔ ان کے ڈریس پھٹے پرانے تھے جن کے بہت سے ستارے جھڑ چکے تھے اور یہ لوگ تماشے بھی بہت پرانے اور دقیانوسی دکھاتے تھے۔ مگر اس کے باوجود یہ کمپنی چل نکلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکٹ کے دام بہت کم تھے۔ شہر کے مزدوری پیشہ لوگ کارخانوں میں کام کرنے والے اور غریب غربا جو دن بھر کی کڑی محنت و مشقت کی کسر شور و غل، خرمستیوں اور ادنیٰ عیاشیوں سے نکالنا چاہتے تھے۔ پانچ پانچ، چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر، گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے، ہنستے بولتے، بانسریاں اور الغوزے بجاتے، راہ چلتوں پر آوازے کستے، گالی گلوچ کرتے، شہر سے پیدل چل کر تھیٹر دیکھنے آتے اور لگے ہاتھوں بازارِ حسن کی سیر بھی کر جاتے۔ جب تک ناٹک شروع نہ ہوتا تھیٹر کا ایک مسخرہ تنبو کے باہر ایک اسٹول پر کھڑا کبھی کولھا ہلاتا، کبھی منہ پھلاتا، کبھی آنکھیں مٹکاتا، عجیب عجیب حیا سوز حرکتیں کرتا جنہیں دیکھ کر یہ لوگ زور زور سے قہقہے لگاتے اور گالیوں کی صورت میں داد دیتے۔

رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس بستی میں آنے شروع ہوئے۔ چنانچہ شہر کے بڑے بڑے چوکوں میں تانگے والے صدائیں لگانے لگے "آؤ کوئی نئی بستی کو"۔ شہر سے پانچ کوس تک جو پکی سڑک جاتی تھی اس پر پہنچ کر تانگے والے سواریوں سے انعام حاصل کرنے کے لالچ میں یا ان کی فرمائش پر تانگوں کی دوڑیں کراتے، منہ سے ہارن بجاتے، اور جب کوئی تانگہ آگے نکل جاتا تو اس کی سواریاں نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ اس دوڑ میں غریب گھوڑوں کا برا حال ہو جاتا اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے بجائے خوشبو کے پسینے کی بدبو آنے لگتی۔

رکشا والے تانگے والوں سے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ ان سے کم دام پر سواریاں

بٹھا، طرارے بھرتے اور گھنگرو بجاتے اس بستی کو جانے لگے۔ علاوہ ازیں ہر ہفتے کی شام کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ ایک ایک سائیکل پر دو دو لدے، جوق جوق اس پُراسرار بازار کی سیر دیکھنے آتے جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کے بڑوں نے خواہ مخواہ انہیں محروم کر دیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس بستی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے اور مکانوں اور دکانوں کی مانگ ہونے لگی۔ وہ بیسوائیں جو پہلے اس بستی میں آنے پر تیار نہ ہوتی تھیں اب اس کی یہ دن دونی رات چوگنی ترقی دیکھ کر اپنی بیوقوفی پر افسوس کرنے لگیں۔ کئی عورتوں نے تو جھٹ زمینیں خرید ان بیسواؤں کے ساتھ اسی وضع قطع کے مکان بنوانے شروع کر دیئے۔ علاوہ ازیں شہر کے بعض مہاجنوں نے بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں زمینیں خرید خرید کر کرایہ پر اٹھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنوا ڈالے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلوں میں روپوش تھیں مور و ملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں اور ان مکانوں میں آباد ہو گئیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اس بستی کے وہ دکاندار آ بسے جو عیال دار تھے اور رات کو دکانوں میں سو نہ سکتے تھے۔

اس بستی میں آبادی تو خاصی ہو گئی تھی مگر ابھی تک بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ان بیسواؤں اور بستی کے تمام رہنے والوں کی طرف سے سرکار کے پاس بجلی کے لیے درخواست بھیجی گئی جو تھوڑے دنوں بعد منظور کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈاک خانہ بھی کھول دیا گیا۔ ایک بڑے میاں ڈاک خانے کے باہر ایک صندوقچے میں لفافے، کارڈ اور قلم دوات رکھ، بستی کے لوگوں کے خط پتر لکھنے لگے۔

ایک دفعہ بستی میں شرابیوں کی دو ٹولیوں میں فساد ہو گیا جس میں سوڈا واٹر

کی بوتلوں، چاقوؤں اور اینٹوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا اور کئی لوگ سخت مجروح ہوئے۔ اس پر سرکار کو خیال آیا کہ اس بستی میں ایک تھانہ بھی کھول دینا چاہیے۔

تھیئٹریکل کمپنی دو مہینے تک رہی اور اپنی بساط کے مطابق خاصا کما لے گئی۔ اس پر شہر کے ایک سینما کے مالک نے سوچا کہ کیوں نہ اس بستی میں بھی ایک سینما کھول دیا جائے۔ یہ خیال آنے کی دیر تھی کہ اس نے جھٹ ایک موقع کی جگہ چن کر خرید لی اور جلد جلد تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔ چند ہی مہینوں میں سینما ہال تیار ہو گیا۔ اس کے اندر ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی لگوایا گیا تاکہ تماشائی اگر بائیسکوپ شروع ہونے سے پہلے آجائیں تو آرام سے باغیچہ میں بیٹھ سکیں۔ ان کے ساتھ بستی کے لوگ یونہی سستانے یا سیر دیکھنے کی غرض سے آآ کر بیٹھنے لگے۔ یہ باغیچہ خاصی سیر گاہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ سقے کٹورا بجاتے اس باغیچے میں آنے اور پیاسوں کی پیاس بجھانے لگے۔ سر کی تیل مالش والے نہایت گھٹیا قسم کے تیز خوشبو والے تیل کی شیشیاں واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونسے، کاندھے پر میلا کچیلا تولیا ڈالے، 'دل پسند دل بہار مالش' کی صدا لگاتے دردِ سر کے مریضوں کو اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔

سینما کے مالک نے سینما ہال کی عمارت کی بیرونی جانب دو ایک مکان اور کئی دکانیں بھی بنوائیں۔ مکان میں تو ہوٹل کھل گیا جس میں رات کو قیام کرنے کے لیے کمرے بھی مل سکتے تھے اور دکانوں میں ایک سوڈا واٹر کی فیکٹری والا۔ ایک فوٹوگرافر، ایک سائیکل کی مرمت والا، ایک لانڈری والا، دو پنواڑی، ایک بوٹ شاپ والا اور ایک ڈاکٹر مع اپنے دواخانہ کے آ رہے۔ ہوتے ہوتے پاس ہی ایک دکان میں کلال خانہ کھلنے کی اجازت مل گئی۔ فوٹوگرافر کی دکان کے باہر ایک کونے میں ایک گھڑی ساز نے آ ڈیرا جمایا اور ہر وقت محدب شیشہ آنکھ پر

چڑھائے گھڑیوں کے کل پرزوں میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دن بعد بستی میں نل، روشنی اور صفائی کے باقاعدہ انتظام کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ سرکاری کارندے سرخ جھنڈیاں، جریبیں اور اونچ نیچ دیکھنے والے آلے لے کر آ پہنچے اور ناپ ناپ کر سڑکوں اور گلی کوچوں کی داغ بیل ڈالنے لگے اور بستی کی کچی سڑکوں پر سڑک کوٹنے والا انجن چلنے لگا۔ . . . .

اس واقعہ کو بیس برس گزر چکے ہیں۔ یہ بستی اب ایک بھرا پُرا شہر بن گئی ہے۔ جس کا اپنا ریلوے اسٹیشن بھی ہے اور ٹاؤن ہال بھی، کچہری بھی اور جیل خانہ بھی۔ آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ شہر میں ایک کالج، دو ہائی سکول، ایک لڑکوں کے لیے، ایک لڑکیوں کے لیے اور آٹھ پرائمری سکول ہیں جن میں میونسپلٹی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ چھ سینما ہیں اور چار بنک جن میں سے دو دنیا کے بڑے بڑے بنکوں کی شاخیں ہیں۔

شہر سے دو روزانہ، تین ہفتہ وار اور دس ماہانہ رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں۔ ان میں چار ادبی، دو اخلاقی و معاشرتی و مذہبی، ایک صنعتی، ایک طبی، ایک زنانہ اور ایک بچوں کا رسالہ ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں بیس مسجدیں، پندرہ مندر اور دھرم شالے چھ یتیم خانے، پانچ اناتھ آشرم اور تین بڑے سرکاری ہسپتال ہیں جن میں ایک صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔

شروع شروع میں کئی سال تک یہ شہر اپنے رہنے والوں کی مناسبت سے "حُسن آباد" کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا۔ مگر بعد میں اسے نامناسب سمجھ کر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر دی گئی: یعنی بجائے "حُسن آباد" کے "حَسَن آباد" کہلانے لگا۔ مگر یہ نام چل نہ سکا کیونکہ

پانسو سے کچھ اوپر بیسواؤں میں سے صرف چودہ ایسی تھیں جو اپنے عشاق کی وابستگی یا خود اپنی دل بستگی یا کسی اور وجہ سے شہر کے قریب آزادانہ رہنے پر مجبور تھیں اور اپنے دولت مند چاہنے والوں کی مستقل مالی سرپرستی کے بھروسے بادلِ ناخواستہ اس علاقے میں رہنے پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ ورنہ باقی عورتوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یا تو اسی شہر کے ہوٹلوں کو اپنا مسکن بنا لیں یا بظاہر پارسائی کا جامہ پہن کر شہر کے شریف محلوں کے کونوں کھدروں میں جا کر بس گی یا پھر اس شہر ہی کو چھوڑ، کہیں اور نکل جائیں گی۔

یہ چودہ بیسوائیں اچھی خاصی مالدار تھیں۔ اس پر شہر میں ان کے جو مملوکہ مکان تھے ان کے دام انہیں اچھے وصول ہو گئے تھے اور اس علاقہ میں زمین کی قیمت برائے نام تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ملنے والے دل و جان سے ان کی مالی امداد کرنے کے لیے تیار تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس علاقے میں جی کھول کر بڑے عالی شان مکان بنوانے کی ٹھان لی۔ ایک اونچی اور ہموار جگہ، جو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہٹ کر تھی، منتخب کی گئی۔ زمین کے قطعے صاف کرائے اور چابکدست نقشہ نویسوں سے مکانوں کے نقشے بنوائے گئے اور چند ہی روز میں تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

دن بھر اینٹ، مٹی، چونا، شہتیر، گارڈر اور دوسرا عمارتی سامان لاریوں، چھکڑوں، خچروں، گدھوں اور انسانوں پر لد کر اس بستی میں آتا اور منشی حساب کتاب کی کاپیاں بغلوں میں دبائے انہیں گنتے اور کاپیوں میں درج کرتے۔ میر صاحب معماروں کو کام کے متعلق ہدایات دیتے۔ معمار مزدوروں کو ڈانٹتے ڈپٹتے۔ مزدور ادھر ادھر دوڑتے پھرتے، مزدورنیوں کو چلا چلا کر پکارتے اور اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے بلاتے۔ غرض سارا دن ایک شور، ایک ہنگامہ رہتا اور

عوام حسن اور حسن میں کچھ امتیاز نہ کرتے ۔ آخر بڑی بڑی بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی اور پرانے نوشتوں کی چھان بین کے بعد اس کا اصلی نام دریافت کیا گیا جس سے یہ بستی آج سے سینکڑوں برس قبل اُجڑنے سے پہلے موسوم تھی اور وہ نام ہے "آنندی!"

یوں تو سارا شہر بھرا پڑا، صاف ستھرا اور خوشنما ہے مگر سب سے خوبصورت، سب سے بارونق اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز وہی بازار ہے جس میں زنانِ بازاری رہتی ہیں۔

آنندی کے بلدیہ کا اجلاس زوروں پر ہے، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہیں۔ بلدیہ کے زیرِ بحث مسئلہ یہ ہے کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

ایک فصیح البیان مقرر تقریر کر رہے ہیں: "معلوم نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے زیرِ اثر اس ناپاک طبقے کو ہمارے اس قدیمی اور تاریخی شہر کے عین بیچوں بیچ رہنے کی اجازت دے دی گئی . . . ."

اس مرتبہ ان عورتوں کے رہنے کے لیے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے بارہ کوس دُور تھا۔